معارف

نومبر ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپے۔فی شمارہ ۳۰؍روپے۔رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں :

Hafiz Sajjad Elahi
196 - Ahmad Block, New Garden Town, Lahore (Punjab) Pakistan
Tel: 0300-4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔

بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Tel. (Ma'arif Section) 06386324437
Email: mailto:info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۸ ماہ ربیع الاول / ربیع الثانی ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۱ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

دارالمصنفین کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو اس کی تاسیس، غرض، غایت کی بھی بات ہوتی ہے۔ یہ احساس بھی اس ذکر سے تازہ ہوتا ہے کہ دارالمصنفین کے تخیل میں صرف ایک جذبہ پنہاں تھا وہ یہ کہ یہ ادارہ اسلام کی خدمت کے لیے خاص ہو۔ جہاں اسلامی علوم کو جدید علم کلام کے رنگ اور طرز میں پیش کیا جائے، اسلامی تہذیب و تمدن کی تشریح اور تبلیغ، دور جدید کے اسلوب میں کی جائے۔ زبان و بیان میں بھی اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت کا اہتمام ہو جس سے قوم و ملت کے مذاق علمی کو خوب تر بنایا جاسکے۔ علامہ شبلی کی یہ بھی تمنا تھی کہ ان خوبیوں سے آراستہ اہل قلم، ہزار دلوں پر حکمرانی کر سکیں۔ اس خواب کی تعبیر جس طرح سو سال سے زیادہ کی مدت میں سامنے آتی رہی وہ بجائے خود ملک و قوم کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے۔

****

۲۰۰۸ء میں اس وقت کے ناظم دارالمصنفین مولانا ضیاء الدین اصلاحی ایک حادثے میں شہید ہوئے۔ یہ سانحہ دارالمصنفین کے لیے حد درجہ اندوہ ناک ہونے کے ساتھ دارالمصنفین کے مستقبل کے لیے بھی نہایت تشویش ناک سوال تھا کہ اس ادارہ کی عظیم علمی خدمات اور خود ادارہ کے وجود کو برقرار و مستحکم کرنے کے لیے مشیت ایزدی کس حوصلہ مند کا انتخاب کرتی ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اس وقت ملک سے باہر تھے اور ذمہ داری کو قبول کرنے سے گریزاں بھی تھے مگر پیہم اصرار کے بعد انہوں نے نظامت کے اس بار گراں کو سنبھالنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ مئی ۲۰۰۸ء کے شذرات ان کی تحریر سے آشنا ہوئے۔ جس میں انہوں نے جہاں یہ اعتراف کیا کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے دارالمصنفین قائم کیا گیا تھا، ان کی تکمیل میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس کے بہت سے منصوبے تشنہ تکمیل ہیں۔ انہوں نے دارالمصنفین کی مالی فارغ البالی پر بھی توجہ کی کہ ”حالات اب ناقابل برداشت ہیں۔ خزاں رسیدہ گلشن بہار کا منتظر ہے اور مریض نیم جاں کی عروق مردہ میں پھر سے زندگی بخش لہو دوڑانے کی ضرورت ہے“۔ اس ضرورت کو انہوں نے عظمت رفتہ کی بازیافت اور تعمیر نو کے لیے ایک ہمہ جہت مہم کا نام دیا۔ اس کے بعد کے دارالمصنفین کی تاریخ بنظر انصاف دیکھی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس مہم کے لیے ظلی صاحب نے اپنی ساری تگ و دو وقف کر دی۔ دارالمصنفین کی تمام کتابیں جدید

اور دیدہ زیب طباعتوں سے مزین ہوئیں۔ نئے موضوعات پر نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ دارالمصنفین کے قیام کے سوسال پورے ہونے پر شبلی صدی کی تقریبات کا شایان شان انعقاد ہوا۔ صرف شبلی سمینار ہی نہیں، سیرت، مصادر سیرت، معماران دارالمصنفین پر علمی مذاکروں کے ساتھ سرسید وحالی پر بھی سمینار ہوئے۔ الندوہ کی مکمل فائل اور معارف کے شبلی نمبر کے ساتھ گذشتہ صدی میں مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے مدیران معارف کے شذراتی تحریروں کا انتخاب شائع ہوا۔ علمی کاموں کی طرح انتظامی امور میں رفقاء اور جملہ عملہ کے مشاہروں میں اضافہ ہوا، بعض عمارتوں کی تعمیر وتزئین ہوئی، ادارہ کی ظاہری خوش ترتیبی پر بھی توجہ کی گئی اور سب سے بڑھ کر شبلی منزل کی موتی مسجد، اعظم گڑھ کی تاج المساجد ہوگئی۔ یہ تو صرف چند عنوانات ہیں یہاں یہ اجمال تفصیل کا متحمل نہیں۔ لیکن اس ہمہ جہت مہم نے ظلی صاحب کی صحت پر جو اثر ڈالا، اس کا شاید کم لوگوں کو اندازہ ہے۔ شبلی کنبہ کے لیے چین کی نیند فراہم کرنے کی سعی میں خود ان کی نیند اڑ گئی۔ ڈیڑھ سال سے وہ درد وکرب کی تصویر بن گئے، ایسے میں وہ بار بار اس ذمہ داری سے سبک دوش ہونے کا اشارہ کرتے رہے۔ گذشتہ مہینے جب مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا تو شدت سے وہ اس بار گراں کو کسی اور کے حوالہ کرنے پر مصر ہوئے۔ ظاہر ہے اراکین مجلس کے لیے یہ سخت ترین لمحہ رہا ہوگا لیکن انتظامی ضرورتوں کا تقاضہ بھی شدید تھا۔ معلوم ہوا کہ اراکین نے غور وفکر کے بعد ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صدر مجلس انتظامیہ سے اس نہایت اہم امانت کو سنبھالنے کی درخواست اس طرح کی کہ ان کے لیے انکار کی گنجائش نہیں رہی۔

****

دیکھنے میں ذمہ داریوں کی منتقلی صرف ایک سطر کا بیان ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ عمل، خدا جانے کتنی مذہبی تنظیموں، اصلاحی اور تعلیمی اداروں اور خاص طور پر مسلمانوں کی سیاسی تنظیموں میں ایک فتنہ اور بلا کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ گاؤں گاؤں میں جماعتوں کے مقامی عہدے داروں کا اعلان اخباروں میں سرخیوں اور تصویروں سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کے ناظم ہونے کی خبر تک عام نہ ہوئی یا نہ کی گئی۔ یہ بھی دارالمصنفین کی تاریخ میں ایک قابل تقلید رویہ کا ظہور ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں محتاج تعارف نہیں، اپنی اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں اور سندوں کے ساتھ وہ عربی، انگریزی کے مشہور صاحب قلم ہیں۔ مسلمانوں کے واحد انگریزی اخبار ملی گزٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کو بین الاقوامی

شہرت ملی۔ ملی اور قومی معاملات میں وہ ملت کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ قدیم وجدید کے مطلوب امتزاج کا ایک نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور اس وقت انھوں نے اپنے کو انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن کے لیے خاص کر رکھا ہے۔ تاہم وہ جس طرح دارالمصنفین اور معارف کے احوال سے مسلسل ربط و تعلق میں رہے، اس سے توقع ہے کہ ان کی فکر جدید اور معرفت قدیم، ادارہ کے لیے باعث نفع و برکت ہوگی۔ ان کے ذہن میں معارف کے لیے کچھ نئے کالموں کی شمولیت ہے۔ مضمون نگاروں کے لیے بھی ان کی چند گزارشات ہیں جو اسی اشاعت اور آئندہ اشاعتوں میں پیش کی جائیں گی۔ دارالمصنفین کے ملازمین ہوں یا اس کے بے شمار مخلصین، دعائیں سب کی یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ادارہ اور صاحب ادارہ کو ہر فتنہ وشر سے محفوظ رکھے اور دین وعلوم دینیہ کی ترویج ان کے لیے آسان کردے۔ دعا یہ بھی ہے کہ ظلی صاحب جلد سے جلد مکمل صحت یاب ہوں اور ان کا سایہ تادیر ادارہ کو زمانہ کی کڑی دھوپ سے مامون رکھے۔

****

نومبر کا مہینہ علامہ شبلی کا ماہ وفات ہے، اس نسبت سے اس مہینہ یا اس کے آس پاس علامہ کی یادوں کو زندہ و تازہ کیا جاتا ہے۔ کورونا اور لاک ڈاؤن نے سمیناروں کو ویبیناروں میں بدل دیا۔ اسی اکتوبر میں دہلی میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز اور مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات کی مشترکہ کوششوں سے دوروزہ ویبینار ہوا۔ موضوع ''عہد جدید کے معلم اول علامہ شبلی نعمانی، حساس مفکر، افکار واصلاحات'' تھا۔ اس میں مولانا سید محمد رابع ندوی، ڈاکٹر تقی الدین ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، پروفیسر سعود عالم قاسمی، پروفیسر سید جمال الدین، پروفیسر ظہور محمد خاں، پروفیسر محمد اسحاق، پروفیسر عبیداللہ فہد، پروفیسر سید سراج اجملی، پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر سید راشد نسیم ندوی، پروفیسر فہیم اختر ندوی جیسے مشاہیر کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم وفکر نے بھی حصہ لیا۔ علامہ شبلی کے افکار واحساسات میں کاش ان کے اس قسم کے جملے موجودہ تناظر میں قوم کی سماعتوں کو آواز دے سکیں کہ ''کسی کے خیالات پر کوئی بار نہیں ڈال سکتا لیکن خود منافق بننا اور دوسروں کو منافق بنانا کیا ضروری ہے۔ افسوس کہ ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی۔ مجھ کو یہ پسند نہیں کہ مذہبی مجلس میں شریک ہوکر جوڑ توڑ کروں، اپنا اثر بڑھاؤں، مخالف کو شکست دوں، اس جنت سے تو دوزخ بھلی، ہم مسلمانوں کی فطرت خدا نے بالکل تباہ کردی ہے''۔

مقالات

عالمی اخوت انسانی کی قرآنی بنیادیں

ڈاکٹر شکیل احمد

shakeel1781@gmail.com

تمام انسان اپنے شعور کی سطح پر اخوت باہمی کا ادراک رکھتے ہیں۔ یہ انسانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے اور اللہ نے اس کی تعلیم و ترسیل کا انتظام بھی اسلام کی شکل میں کیا ہے۔ اسلام عالمی اخوت انسانی کا داعی ہے۔ اخوت انسانی کے قیام کے لیے اسلام سے ہٹ کر بھی کوششیں ہوئیں ہیں اور عالمی سطح تک آج بھی جاری ہیں۔ دراصل انسان کی ساخت، اس کے فطری جذبات، اس کے نوعی مفادات اور اس کی بنیادی ضرورتیں متقاضی ہیں کہ ان کے اجتماع میں اخوت جاری و ساری ہو۔ ظاہر ہے کہ اس اخوت کا براہ راست تعلق انسان کے مقصد زندگی سے ہوگا۔ اگر یہ مقصد منصفانہ اور لائق عمل ہو تو انسانوں کی باہمی اخوت بھی صالح ثمرات کی امین ہوگی۔ لیکن اگر یہ مقصد کوتاہ اندیش اور وقتی مصالح کا تابع ہوگا تو انجام کار اخوت انسانی بھی اختلافات و نزاعات کی شکار ہو کر پارہ پارہ ہو جائے گی۔ بدنصیبی سے اس وقت عالمی اخوت کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں یا ماضی میں کی گئیں، وہ انسان کے صحیح مقصد حیات کو نہ پہچان سکیں۔ اور نتیجتاً اس تگ و دو میں انسانوں کے جان و مال اور اوقات جیسی بیش قیمت چیزوں کا ضیاع تو ہوا لیکن انسان کو مطلوبہ سکون اور اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ بلکہ یہ کاوشیں نوع انسانی میں نوع بہ نوع تقسیم اور انتشار کا مظہر بن گئیں۔ جن کا انتہائی نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا جنگ اور دہشت کے سائے میں نوع انسانی کی تباہی و بربادی کے قریب تر ہو چکی ہے۔

ہدایت الٰہی سے محروم انسانی فکر نے سوچا کہ انسان کی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اس کے خاندان اور اس کے قبیلے میں ہی تو پرورش پاتی ہیں، لہٰذا ان اداروں کی خدمت کو اولین ترجیح دینا ہی تمام انسانوں کی باہمی اخوت کو فروغ دینے کا ذریعہ بنے گا۔ چنانچہ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کی تائید و نصرت اور ان کے دشمنوں سے دفاع کو انسانوں کا مقدس فریضہ قرار دیا۔ حالانکہ یہ اکثر صورتوں میں ظلم و جور کا راستہ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس روش کی نکیر کی ہے:

قالوا بل نتبع ما الفينا عليه آبائنا اولو كان آباؤهم لايعقلون شيئاً ولايهتدون۔

(البقرة:۱۷۰)

(وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟)

رسول اللہؐ نے خاندان اور قبیلے پر غرور کرنے سے واضح طور پر منع فرمایا ہے:

لینتھین اقوام یفتخرون بأبائہم الذین ماتوا انما ھم فحم جھنم اولیکونن اھون علی اللہ عزوجل من الجعل الذی یدھدہ الخرء بأنفه ان اللہ اذھب عنکم عبیته الجاھلیته وفخرھا بالاباء انما ھومومن تقی وفاجر شقی الناس بنوآدم وآدم خلق من التراب۔(۱)

(لوگ زمانہ جاہلیت میں) مرے ہوئے باپ دادا پر فخر کرنا بالکل چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ وہ تو جہنم کا کوئلہ بن چکے ہیں۔ ورنہ وہ اللہ کے نزدیک اس گبریلے سے زیادہ ذلیل ہوں گے جو گندگی کو اپنی ناک سے لڑھکاتا پھرتا ہے۔ اللہ تعالی نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر فخر کو دور کر دیا ہے۔ آدمی بس دو طرح کے ہیں صاحب ایمان اور خداترس یا بدکردار اور بدبخت لوگ، سارے کے سارے آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔)

خاندان اور قبیلے پر فخر وغرور کسی بھی دور میں اخوت انسانی قائم نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ بنیادی مفروضہ ہی درست نہیں تھا کہ انسان کی توانائیاں اس کے خاندان یا قبیلے کی عطا کردہ ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے نشوونما میں تنہا اس کا خاندان یا اس کا قبیلہ ہی موثر رول ادا نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے گردوپیش کے دیگر خاندان اور قبائل حتیٰ کہ اس کے ماحول کے غیر انسانی عوامل بھی ایک رول ادا کرتے ہیں۔ انسان نے اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ اپنے مال ودولت کو شریک وسہیم بنانا چاہا تو عزت وبرتری کے لیے ایک نئی قسم کی کشمکش برپا ہوگئی۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ سے مقابلہ کے لیے ایک کمانڈر کے انتخاب کی درخواست کی تو ہم عصر نبی نے طالوت کو مقرر کر دیا جو جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے دوسروں پر فائق تھے لیکن قوم نے ان کی ان صلاحیتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اعتراض کیا:

قالوا انی یکون له الملك علینا ونحن احق بالملك منه ولم یوت سعة من المال۔ (البقرۃ:۲۴۷)

(وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے"۔)

انسانی فکر کی تنگ نظری نے اسے صرف اپنے قبیلے تک محدود رکھ کر اس کی جملہ مساعی کا دائرہ کار ہی

محدود کردیا، اخوت انسانی کے فروغ میں کوئی رول ادا نہیں کیا۔ چنانچہ انسان نے اپنے مربیوں کا دائرہ صرف اپنے خاندان اور اپنے قبیلے سے بڑھا کر اس میں اپنے تمام ہم زبانوں اور ہم نسلوں کو بھی شریک کرلیا۔ لیکن اس حل نے انجام کار لسانی اور نسلی تعصب تو پیدا کیا، انسان کو اخوت انسانی کی منزل تک نہ پہنچا سکا کیونکہ انسان کے ہم زبان اور ہم نسل افراد کا دائرہ خواہ کتنا بھی وسیع ہو، ان تمام افراد پر محیط نہیں ہوتا جو اس کے معاشی، سماجی اور ثقافتی روابط میں اس کے معین ہوتے اور اس کو قرب و یگانگت کا احساس دلاتے ہیں۔ قرآن رنگ و نسل اور اختلاف لسان کی نیرنگی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن انہیں خالق کائنات کی قدرت واختیار کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے:

ومن آیٰته خلق السمٰوت والارض واختلاف السنتکم والوانکم انّ فی ذٰلك لاٰیٰت للعالمین۔ (الروم:۲۲)

(اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔)

نژاد، رنگ اور نسل کے تنگ نامے نے فکر انسانی کو جغرافیائی شناختیں اپنانے کی طرف راغب کیا۔ اس فکر نے انسان کو قوم اور وطن کے تصور کا اسیر کردیا جو انسانوں کے لیے ایک نئے قسم کے خدا تو بن گئے لیکن اخوت انسانی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔ صرف پچھلی صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے نام پر دو محاربات عظمیٰ کے علاوہ ہزاروں سرحدی اور قومی جنگیں لڑی جاچکی ہیں۔ جن میں لاکھوں انسانی جانوں کے ناحق اتلاف کے علاوہ کروڑوں، اربوں روپیوں کے قیمتی اثاثے بھی برباد ہوئے۔ اگر جنگ نہ بھی ہو تب بھی ان تصورات کی بنیاد پر سرد جنگ کا ماحول تو ضرور ہی گرمایا رہتا ہے۔

یقیناً وحدت انسانی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ قرآن اس سے انکار نہیں کرتا بلکہ وحدت انسانی کو مجروح کرنا فرعون وہامان جیسے مستکبرین اور فتنہ پرداز لوگوں کی عادات میں شمار کرتا ہے۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعاً یستضعف طائفة منهم یذبح ابناءهم و یستحی نساء هم انه کان من المفسدین۔ و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمة و نجعلهم الوارثین۔ و نمکن لهم فی الارض و نری فرعون و هامٰن وجنودهما منهم ما کانوا یحذرون۔ (القصص:۴تا۶)

(واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کردیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو

زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے۔اور انہیں پیشوا بنادیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلادیں جس کا انہیں ڈر تھا۔)

دراصل قرآن صاف صاف گواہی دیتا ہے کہ تمام انسانوں کی ابتدائی حالت وحشت وجہل کی حالت نہیں تھی بلکہ وہ اتحاد باہمی اور ہم آہنگی کے رشتہ میں پیوستہ تھے:

وما کان الناس الا امة واحدة فاختلفوا ولولا کلمة سبقت من ربك لقضی بینهم فیما فیه یختلفون۔(یونس:۱۹)

(ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنالیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کرلی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کررہے ہیں اس کا فیصلہ کردیا جاتا۔)

قرآن دعویٰ کررہا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جمعیت کبھی پائی جاتی تھی تو وہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ وہ سب مل کر ایک امت واحد کا نقشہ پیش کرتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی شہادت دی ہے کہ تمام مردو خواتین آپس میں اخوت کا رشتہ رکھتے ہیں۔خدا کو گواہ بناتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

ان العباد کلهم اخوة(۲)

(اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ سارے ہی انسان آپس میں بھائی ہیں۔)

یہ حالت ایک عرصے تک قائم رہی لیکن پھر بعد کے انسانوں کے درمیان اختلاف رونما ہوا جس کے نتیجہ میں ان کی جمعیت پارہ پارہ ہوگئی۔یہ کسی مصلحت خداوندی کی وجہ سے ہے کہ انہیں کچھ عرصہ کے لیے ڈھیل دے دی گئی ہے۔ورنہ ہاتھ کے ہاتھ بھی ان کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کی وجہ پر بھی روشنی ڈالی ہے:

فما اختلفوا الا من بعد ما جآءهم العلم بغیاً بینهم۔(الجاثیہ:۱۷)

(پھر جو اختلاف ان (بنی اسرائیل) کے درمیان رونما ہوا وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔)

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرہ میں اخوت کے انتشار کی دو وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔آپسی بغاوت اور سرکشی اور ۲۔ایک خاص قسم کا علم جو ان تک پہنچا۔یہ خاص علم جو انسانوں کو حاصل ہوا اسے ''بدیا'' کا نام بھی دیا گیا ہے جسے عرف عام میں جادو سمجھا جاتا ہے۔قرآن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں نے جادو کا علم بابل میں سیکھا تھا۔قرآن میں سحر کی جن شکلوں کا ذکر ملتا ہے ان میں سے دو شکلیں

ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ایک شکل تو اسی بابلی سحر کی ہے جسے سکھانے سے پہلے ہی شاگرد کو بتادیا جاتا تھا کہ جادو کے نام سے جو علم سکھایا جائے گا، وہ دراصل ایک آزمائش ہے۔ لہٰذا سیکھنے والے کو چاہیے کہ کفر نہ اختیار کرے۔ اس کے باوجود دنیا کے پرستار لوگ جادو سیکھنے سے باز نہیں آئے کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اس طرح وہ دوسرے لوگوں کے خلاف خاموشی کے ساتھ سرکشی اور بغاوت کی کارستانیاں کر سکتے ہیں۔ لیکن اس بابلی جادو کی جو اصل حقیقت تھی اسے قرآن نے وضاحت کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فیتعلمون منھما ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ وما ھم بضآرین بہ من احد الا باذن اللہ ویتعلمون ما یضرھم ولا ینفعھم۔(البقرۃ:۱۰۲)

(پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں، بلکہ نقصان دہ تھی۔)

فرد کا زوج ایک روحانی عنصر ہوتا ہے اور جب وہ اصل انسان سے برگشتہ ہو جاتا ہے، تو انسان کی سرگرمیوں میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تعطل سے قطع نظر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کسی شخص کو نفع یا نقصان پہنچانے کا کوئی اختیار کسی جادوگر کو حاصل ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں، کوئی بھی جادوگر کسی بھی انسان کو نفع یا نقصان پہنچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ انسان کے روزمرہ میں شیطانی چالوں کے ذریعہ رکاوٹ ڈالنے کے علاوہ جادوگر کچھ بھی نہیں کر سکتا، حتّٰی کہ اس کے جادو کا اثر بھی تب ہی اور اسی حد تک ہوتا ہے جہاں تک مشیت الٰہی اس کی اجازت دے۔ چنانچہ جادو دراصل ایک بے فائدہ عمل ہے، جس سے انسانوں کی باہمی اخوت کو زک بھلے ہی پہنچانے کی کوشش کی جائے لیکن اس کوشش کا انجام اذن اللہ پر منحصر ہوتا ہے۔

جادو کے کاموں میں دوسرا ذریعہ ہے شریر جنات کے ذریعہ بے جا مدد کرنا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کا اعتراف خود جنات کی ایک جماعت کے ذریعہ ان الفاظ میں کرایا ہے:

وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقاً۔(الجن:۶)

(اور یہ کہ ”انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا“۔)

یہ ہے غیر اللہ کی پوجا کی اصل حقیقت اور اس کی موجودگی میں تمام انسانوں کی باہمی اخوت مشکوک ہی رہے گی۔ اس پوری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: اول یہ کہ جادو بھی اعمال کفر وشرک سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری یہ کہ اعمال کفر وشرک انسان کی آفاقی اخوت کے منافی ہیں۔

اس صورت حال میں قابل غور وہ نسخہ ہے جسے قرآن نے عالمی اخوت انسانی کے قیام کے لیے تجویز کیا ہے۔

مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ نسخہ صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے۔ ''صراط مستقیم''، یعنی لا تعبدوا الشیطان اور اگر اس صراط مستقیم کی تفصیلات تلاش کرنی ہو تو قرآن مجید اور اسوہ رسولؐ اس کا معیار ہیں۔ بندگان خدا کی آسانی اور ہدایت کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں صراط مستقیم کی وضاحت کردی ہے:

ان لا تعبدوا الشیطان انه لکم عدو مبین۔ وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم۔ (یٰس: ۶۱-۶۰)

(شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی بندگی کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔)

شیطان کی پرستش سے مکمل گریز اور اس کی جگہ صرف اللہ کی عبادت ہی انسان کے لیے صراط مستقیم ہے۔ جو اسے نہ صرف آخرت میں سرخ رو کر سکتی ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اسے باہمی اخوت کے ماحول سے آشنا کر سکتی ہے، جو اللہ کو بھی مطلوب ہے۔ وہ اس دنیا میں انسانوں کے درمیان باہمی اخوت سے سرشار معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر اس نے اس دنیا میں اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا تھا اور اپنی کتابیں نازل فرمائی تھیں:

کان الناس امة واحدة فبعث الله النبین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیه۔ (البقرة: ۲۱۳)

(ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کرے۔)

قرآن مجید کی تصریحات سے واضح ہے کہ صراط مستقیم سے تمسک کے دو پہلو ہیں: نظری اور عملی۔ نظری لحاظ سے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب ایمان ہو یعنی اللہ اور اس کے رسولوں اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور عملی لحاظ سے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعمال صالحہ انجام دیتا رہے:

الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون۔ (التین: ۶، فصّلت: ۸)

(سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔)

عالمی اخوت انسانی کے لیے قرآن کا یہ پروگرام مستقل اور پائیدار بنیادیں فراہم کرتا ہے اور اس پروگرام کی تفصیل میں جانے سے اندازہ ہوگا کہ یہ تمام انسانوں کی باہمی اخوت کے لیے کیوں ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔

اخوت انسانی کی قرآنی بنیادیں

(۱) خدائے واحد کی عبادت: خدائے واحد کی عبادت اخوت انسانی کی مضبوط بنیاد ہے کیونکہ وہ خدا صرف انسانوں (یا مسلمانوں) کا رب نہیں ہے بلکہ ''رب العالمین'' ہے قرآن کے مطابق اس خدا کی عبادت ہی با ارادہ مخلوقات کی زندگی کا مقصد وحید ہونا چاہیے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (الذٰریٰت:۵۶)

(میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔)

اس خدائے واحد نے اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہی ان سب پر حکمراں ہے:

انّ ربّکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایّام ثمّ استوٰی علی العرش یغشی الیل النھار یطلبہ حثیثاً وّالشّمس والقمر والنجوم مسخرٰت بامرہ الا لہ الخلق والامر تبٰرک اللہ رب العٰلمین۔ (الاعراف:۵۴)

(درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار ہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔)

وہی رب العالمین تمام انسانوں کا خالق و مالک اور معبود و حاکم ہے۔ انسانوں کی تمام ضروریات زندگی اسی کی پیدا کردہ ہیں اور وہی ان کے نظم و اہتمام پر قادر ہے۔ وہی موت و حیات کا مالک بھی ہے اور مرض و صحت کا بھی۔ وہی انسانوں کو تنگ دستی یا خوشحالی سے دوچار کرتا ہے اور وہی انسانوں کی حاجت روائی کرتا ہے۔ انسان کی زندگی میں جو کچھ گذرتا ہے وہ اسی منعم و محسن خدا کے اشارہ پر منحصر ہے۔ لہٰذا قرآن انسان سے سوال کرتا ہے:

یاَیھا الانسان ما غرک بربک الکریم الذی خلقک فسوٰک فعدلک۔ (الانفطار:۶،۷)

(اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا۔)

کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی ایسا معبود ہے؟ (لقمان:۱۱، الاحقاف:۶) نہیں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے ایک مچھر کی بھی تخلیق کی ہو۔ تمام انسانوں کے ساتھ یکساں شفقت و مودت کا برتاؤ کرنا تو دور کی بات رہی۔ پھر

ایک سے زیادہ خدا موجود ہونے کا امکان تو اور بھی باطل ہے۔ کائنات میں جو استقرار اور نظم پایا جاتا ہے وہ خود اس بات کی نفی کرتا ہے:

لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا فسبحٰن اللہ رب العرش عما یصفون۔ (الانبیاء:۲۲)

(اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین وآسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔)

لوگ اللہ سے بھاگ کر کفر اس لیے اختیار کر رہے ہیں کہ بالآخر اللہ مالک یوم الدین بھی ہے۔ اپنے اعمال کی عقوبت سے فرار کا امکان انہیں اللہ کی نافرمانی کی راہ دکھا رہا ہے اور وہ انسانی اخوت کا لحاظ رکھے بغیر اس طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ جبکہ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری انسانوں کو آپس میں بھائی بھائی بناتی ہے۔ خود قرآن گواہی دیتا ہے:

انما المؤمنون اخوۃ (الحجرات:۱۰) (مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔)

(۲) اتباعِ رسل: نبوت ورسالت کسی انسان کا اپنا ذاتی کرشمہ یا اپج نہیں ہے اور یہ بات آچکی ہے کہ اللہ نے نبوت کا سلسلہ اس لیے جاری کیا کہ تمام انسان ابتدائی حالت میں باہم مل کر ایک امت واحدہ کی طرح اس دنیا میں رہ رہے تھے۔ لیکن ان کے درمیان 'بدّیا' (العلم) پھیل گئی تو انہوں نے اس اخوت کا رشتہ ترک کر دیا اور ایک دوسرے کے خلاف باغیانہ روش پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اس خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے انبیاء نے صرف ایک راہ اختیار کی کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا، اور یہ بلاوا بھی کسی قانون یا جبر وزور کے ذریعہ نہیں تھا بلکہ انذار وتبشیر کے انداز میں افہام وتفہیم کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا۔ جو ہر بستی اور ہر امت میں سرگرم عمل رہے:

وان من امۃ الّا خلا فیھا نذیر (فاطر:۲۴)

(اور کوئی امت ایسی نہیں گذری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔)

لیکن ان سب کی دعوت ایک ہی تھی:

وما آرسلنا من قبلك من رّسول الّا نوحی الیہ انّہ لآ الٰہ الّا انا فاعبدون (الانبیاء:۲۵)

(ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔)

مسلمان ان تمام انبیاء ورسل پر ایمان رکھتے ہیں جن کے نام اور جن کی تعلیمات معلوم تاریخ میں موجود ہیں اور ان انبیاء ورسل پر بھی جن کی طرف اسلامی مآخذ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ان کے متبعین کی

افرادی طاقت اور ان کے دائرہ اثر سے قطع نظر ان سب کا بنیادی پیغام ایک ہی تھا۔ اس لیے وہ ان کے درمیان تفریق و امتیاز کی کوئی وجہ نہیں پاتے:

کلّ اٰمن باللّٰہ وملٰئکتہ و کتبہ ورسلہ لا نفرّق بین احد مّن رّسلہ (البقرۃ: ۲۸۵)

(یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔)

انبیاء و رسل پر یہ ایمان عالمی اخوت انسانی کا ایک بڑا محرک اور ٹھوس بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان گذشتہ انبیاء و رسل میں سے دو پیغمبروں حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کو خاص طور سے باقی ماندہ انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے:

و لقد ارسلنا نوحاً و ابراھیم و جعلنا فی ذرّیّتھما النبوّۃ و الکتاب فمنھم مھتد (الحدید: ۲۶)

(اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی۔)

ان میں سے حضرت ابراہیمؑ کے ماننے والوں میں نصاریٰ، یہود اور مسلمانوں کے علاوہ بعض ان حضرات کا نام بھی لیا جاتا ہے جو مذاہب براہیمی میں سے کسی مذہب کا اتباع کرتے ہیں۔ قرآن میں صرف دو پیغمبروں کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک تو رسول اللہؐ اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہوگا۔ (الاحزاب: ۴۰) یہ بات گویا کہ اس بات کی بشارت ہے کہ آپؐ کی نبوت کے دور میں عالم انسانیت ایک امت واحد بن جائے گی اور پھر کسی نبی کی ضرورت نہ رہ جائے گی۔ انبیاء و رسل پر ایمان کے ضمن میں ملائکہ اور کتب سماویہ پر ایمان رکھنا بھی آجاتا ہے۔ انسانوں کی زندگی خاص طور سے ان کی ہدایت میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے لیکن بدنصیبی سے قرآن کے علاوہ دیگر منزل کتابیں انسانی کتربیونت اور تحریف کی نذر ہو گئیں، اس لیے انہیں انسانی سعادت کے لیے معیار تو نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن منجملہ انسانی بہبود کا کام وہ اب بھی کرتی ہیں۔

(۳) اعمال صالحہ: انسان کے ایمان کی اصل کسوٹی اس کے اعمال ہیں۔ انسان کی زندگی پر جو بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ اس کے اعمال کے اکتساب سے ہی مرتب ہوتے ہیں:

کل امرئ بما کسب رھین (الطور: ۲۱) (ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔)

ولا تکسب کل نفس الا علیھا (الانعام: ۱۶۴) (ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔)

اس اکتساب میں اعمال سئیات اور اعمال حسنات کے اثرات یکساں نہیں ہوتے:

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة (فصلت: ۳۴) (اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔)

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اعمال صالحہ برے اثرات کو بھی زائل کر دیتے ہیں:

انّ الحسنٰت یذھبن السیاٰت ذٰلك ذکریٰ للذٰکرین (ھود: ۱۱۴)

(در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔)

ذیل میں بعض ایسے اعمال صالحہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جو عالمی اخوت انسانی کے قیام میں معاون ہو سکتے ہیں۔

تقویٰ: تقویٰ معرفت خداوندی میں ہی معاون نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور معاشرہ میں خیر و برکت کے فروغ اور منہیات کے ازالہ کا تقاضہ بھی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اعلان ہے:

یاَیھا الناس انّا خلقنٰکم من ذکر وّانثیٰ و جعلنٰکم شعوباً و قبآئل لتعارفوا انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم انّ اللہ علیم خبیر (الحجرات: ۱۳)

(لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔)

اس طرح اسلام نے رنگ و نسل، رہن سہن اور بول چال یا خاندان، قبیلہ یا قوم کو معیار عزت و ذلت بنانے کو مسترد کر کے انسان کے اس وصف کو معیار بنایا ہے کہ وہ اللہ کا مخلص بندہ ہو اور بندگان خدا کے حقوق کی ادائیگی کرتا ہو۔ چنانچہ رسولؐ نے مادی وسائل اور انسان کی دلی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

الحسب المال والکرم التقویٰ (۳) (حسب تو مال ہے اور بزرگی تقویٰ ہے۔)

تقویٰ کی صفت انسان کو ایسے بہت سے کاموں پر آمادہ کرتی ہے جو انسانی اخوت کے فروغ میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ مثلاً بھلائی اور نیکی کے کاموں میں تعاون کرنا اور حق تلفی و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرنا:

وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتّقو اللہ انّ اللہ شدید العقاب (المائدۃ: ۲)

(جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔)

ہر کسی کے ساتھ عدل و احسان، صلہ رحمی اور بے حیائی و دیگر منکرات سے پرہیز:

انّ اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشآء و المنکر والبغی

یعظکم لعلکم تذکرون (النحل:۹۰)

(اللہ عدل و احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔)

ایفائے عہد و پاس مکیال

واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا۔ واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم (بنی اسرائیل:۳۴،۳۵)

(عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔)

عدل: قرآن نے عدل کرنے پر اتنا زور دیا ہے کہ اسے تقویٰ سے قریب ترین صفت بتایا ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب معاملہ اغیار کے ساتھ پیش آئے:

ولا یجرمنکم شنأن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلو ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (المائدۃ:۸)

(کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔)

قرآن میں صرف فیصلوں میں عدل برتنے پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان مقدمات میں گواہی دینے میں بھی پوری ایمان داری اور دیانت برتنے کی بھی تاکید کی گئی ہے:

یایھا الذین اٰمنوا کونوا قوٰمین بالقسط شھداء للہ ولوعلیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین (النساء:۱۳۵)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔)

مساوات: اسلام انسانی مساوات کو اخوت انسانی سے کم اہمیت نہیں دیتا ہے۔ مساوات پر اس زور کی متعدد وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ رب العالمین ہے۔ اس کا کوئی قبیلہ نہیں، کوئی خاندان نہیں، کوئی خطہ یا ملک نہیں۔ لہٰذا کسی کے ساتھ بھی اس کا کوئی رشتہ یا ناطہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ خصوصی امتیاز برتے اور دوسروں پر ترجیح دے۔ انسانوں کا رب العالمین کے ساتھ صرف ایک ہی رشتہ ہے کہ وہ سب

اس کے بندے ہیں۔ لہٰذا یہ رشتہ ہی انسانی اخوت کا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ اللہ کے تمام بندے فطری طور پر آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس کے بعد انسان کی اصل پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان صرف ایک نفس واحد سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک نفس سے انسان کا جوڑا بنا، اور ان دونوں کی نسل سے دنیا کے تمام کنبے، قبیلے، جماعتیں اور قومیں وجود میں آئیں:

یایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکرٍ و انثیٰ وجعلنٰکم شعوباً و قبآئل لتعارفوا (الحجرات:۱۳)

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔)

انسان کی پیدائش کی یہ حقیقت اس کے فخر و امتیاز کے تمام باطل معیارات کا قلع قمع کردیتی ہے اور انسانوں کی باہمی اخوت کا بیج بو دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر ہی اعلان کر دیا تھا:

یایھا الناس الا ان ربّکم الواحد وان اباکم واحد۔ الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (۴)

(اے لوگو! سن لو بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ (بھی) ایک ہے۔ سن لو کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو سفید پر سوائے تقویٰ کے اور کسی بنیاد پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔)

لہٰذا رنگ و نسل یا لسان و ملک کی بنیاد پر مشتمل انسانوں کی تقسیم ناقص اور باطل ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدمؑ کو مکرم بنایا ہے:

ولقد کرمنا بنی اٰدم وحملنٰھم فی البر والبحر و رزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً (بنی اسرائیل:۷۰)

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدمؑ کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔)

اس تکریم میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں، اس لیے ان کے درمیان اخوت ایک فطری رشتہ ہے۔ حتیٰ کہ اس معاملہ میں صنفی تفریق بھی بجا نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام نے خانگی نظم کی خاطر مردوں کو خواتین پر

قوام بنایا ہے لیکن اس سے ان کا حق مساوات کم نہیں ہوتا۔ اکتساب اور ثواب و عقاب کے لحاظ سے خواتین بھی مردوں کے ہم پلہ ہیں:

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنسآء نصیب مما اکتسبن (النساء: ۳۲)

(جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔)

غیر مسلمین سے حسن سلوک: قرآن نے عالمی اخوت انسانی کے فروغ کے لیے ''کلمہ سوا'' کا فارمولا پیش کیا ہے:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئاً وّلا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ (آل عمران: ۶۴)

(اے نبیؐ کہو، ''اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے''۔)

اسلام میں اہل کتاب خصوصی ترجیح کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح عالمی اخوت انسانی کا دائرہ دنیا کی تقریباً دو تہائی آبادی تک وسیع ہو جاتا ہے۔ تاہم اسلام اس بات کا امکان مسترد نہیں کرتا کہ اس وسیع و عریض دنیا میں کچھ لوگ ایسے رہ جائیں جو اسلام کے دائرہ اخوت سے باہر رہنے پر مصر ہوں۔ اسلام ایسے لوگوں کو بجبر اپنے دائرہ اخوت میں داخل کرنے کی راہ اختیار نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس طرح کی زور زبردستی جائز ہی نہیں:

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (البقرۃ: ۲۵۶)

(دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔)

اللہ رب العالمین کی اسکیم میں زور وزبردستی والا اسلام ہے ہی نہیں۔ قرآن واضح طور پر کہتا ہے:

ولوشاء ربك لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین (یونس: ۹۹)

(اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن وفرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہو جائیں؟)

لیکن خالق کائنات کا یہ منشاء بھی نہیں ہے کہ معترضین و منکرین کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ ان کی اصلاح کے لیے قرآن نے دفاع سیئات اور موعظ حسنہ کے طریقے تجویز کیے ہیں:

ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ (المؤمنون:۹۶)

(اے نبیؐ! برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو۔)

ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل:۱۲۵)

(اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔)

اس مشن میں تگ و دو ہی اسلام کا اصل مقصود ہے لیکن اس انتہائی جدوجہد کے درمیان بھی تکریم انسانی کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ قرآن نے غیر مسلمین کو ان کے اپنے دین پر پابند رہنے کی آزادی دی ہے:

لکم دینکم ولی دین (الکافرون:٦) (تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔)

خاص طور سے غیر مسلم اکابر کا اکرام کیا جائے گا۔ جس کی تنبیہ رسولؐ اللہ نے کی ہے:

اذاجائکم کریم قوم فاکرموہ (۵)

(جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی شریف آدمی آئے تو اس کا اکرام کرو۔)

میثاق مدینہ گواہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے غیر مسلمین کو ان کے دین کے بارے میں پوری چھوٹ دی تھی۔ اس سے قبل بھی رسولؐ اللہ نے بہت سے غیر مسلم قبائل کو مسلمانوں کے حلفاء میں شامل کیا تھا۔

حوالے

(۱) ابوہریرہ، سنن الترمذی، کتاب المناقب، حدیث نمبر:۳۹۵۵۔

(۲) زید بن ارقم، سنن ابوداود، حدیث نمبر:۱۵۰۸۔

(۳) سمرہ، المستدرک علی الصحیحین، کتاب النکاح، حدیث نمبر:۲۷۳۷۔

(۴) جابر بن عبداللہ، مسند احمد، ۴۱۱/۵۔

(۵) جابر بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، کتاب الادب، حدیث نمبر:۳۲۳۹۔

قاضی ابوسعید سیرافی
اوران کی تصنیف اخبار النحویین البصریین

مولانا کفیل احمد میواتی قاسمی

Mob. 9634113051

فن نحو اسلامی علوم میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ نص فہمی میں نحو و صرف کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔اس لیے فن نحو کو نمک سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح کھانے میں نمک نہ ہو تو بدمزہ رہتا ہے، اسی طرح کلام میں نحوی قواعد کی رعایت نہ کی جائے (۱) تو وہ غیر واضح اور غلط ہو جاتا ہے۔

جب دائرہ اسلام کے بڑھنے کے ساتھ عجمی بھی اسلام میں داخل ہوئے جو عربی زبان کو برتنے میں غلطی کرنے لگے، حتی کہ قرآن کریم میں بھی فاش غلطیاں ہونے لگیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے عربی قواعد کے سلسلے میں کچھ راہنما خطوط طے کر کے اپنے شاگرد ابوالاسود دؤلی (متوفی ۶۹ھ) سے فرمایا: انح ہذا النحو یا اباالاسود۔ اور ابوالاسود کے سامنے اسم، فعل، حرف، رفع، نصب اور جر وغیرہ کی تشریح کی۔ (۲)

علم نحو کی وضع و تدوین میں حضرت علیؓ کے بعد ابوالاسود (متوفی ۶۹ھ)، نصر بن عاصم (متوفی ۸۹ھ)، عبدالرحمن بن ہرمز (متوفی ۱۱۷ھ) جیسے اکابر امت شامل تھے ان کے بعد فن نحو کے ارتقاء و کمال میں امام النحو واللغہ خلیل بن احمد فراہیدی (متوفی ۱۷۴ھ) اور ان کے تلامذہ کا خاص کردار رہا؛ چنانچہ ان کے شاگرد رشید امام سیبویہ (متوفی ۱۸۰ھ) نے ''الکتاب'' کے نام سے فن نحو کی سب سے اہم کتاب تصنیف کر کے داد تحقیق دی، جسے ''قرآن النحو'' کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ''الکتاب'' بلاشبہہ فن نحو کی ام الکتاب ہے، جسے علمائے امت نے تحقیق و تشریح کا مرکز بنایا۔ لیکن مکمل کتاب کی شرح لکھنے کا امتیاز شیخ قاضی ابوسعید سیرافیؒ کو حاصل ہے، ان کی شرح الکتاب کی سب سے مفصل اور اہم شرح ہے۔ ذیل میں ہم شارح الکتاب (لسیبویہ) کے حالات زندگی بیان کرنے کے ساتھ، تراجم نحات بصرہ پر مرجع اور سند سمجھی جانے والی ان کی تصنیف اخبار النحویین البصریین کا تعارف پیش کریں گے۔

نام و نسب: ابوسعید سیرافی (۳) کا پورا نام ابوسعید حسن بن عبداللہ بن مرزبان سیرافی ہے۔ ان کے والد پہلے مجوسی تھے جن کا نام بہزاد تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ (۴)

ولادت: سیرافی کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں لکھا ہے کہ ان کی ولادت ۲۹۰ھ سے قبل ہوئی۔ جبکہ سیرافی کے شاگرد ابوحیان توحیدی نے ''الامتاع والموانسۃ'' میں

اور یاقوت حموی نے ''معجم الادباء'' میں لکھا ہے کہ ان کی ولادت ۲۸۰ھ سے قبل ہوئی اور ''وفیات الاعیان'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا سن ولادت ۲۸۴ھ ہے۔(۵)

وطن: شیخ ابوسعید کا وطن ایران کا مشہور شہر سیراف (بکسر السین) ہے۔ جو کرمان سے متصل ساحل سمندر پر واقع ہے۔ ابن خلکان کے بقول سیراف زرخیز علاقہ ہے، وہاں بہت علماء پیدا ہوئے ہیں۔

صاحب تلخیص الآثار نے شہر سیراف کے بارے میں لکھا ہے کہ بحر فارس کے ساحل پر واقع شہر سیراف خوش حال شہر ہے، جہاں باغات کی کثرت ہے، پہاڑ سے اترتی نہریں اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتی ہیں، یگانۂ روزگار ابوسعید سیرافی یہیں کے باشندے ہیں۔ انہوں نے ''الکتاب'' کی شرح لکھی جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔(۶)

حصول تعلیم: ابوسعید سیرافی کی ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی۔ چنانچہ پہلے قرآن کریم حفظ کیا، اس کے بعد شیخ ابو ذکوان اور شیخ عسل بن ذکوان سے علم حاصل کیا۔ قرأت کی تعلیم شیخ ابو بکر بن مجاہد سے اور زبان وادب کی تعلیم ابن درید سے حاصل کی اور فن نحو شیخ ابو بکر محمد بن السری معروف بہ ابن السراج اور شیخ ابو بکر محمد بن علی معروف بہ ''مبرَمان'' سے حاصل کیا، چنانچہ ''اخبار النحویین البصریین'' میں سیرافی لکھتے ہیں کہ ابن السراج اور مبرمان دونوں سے میں نے علم نحو پڑھا ہے۔ کتاب سیبویہ بھی انہی سے پڑھی ہے۔(۷)

ابوسعید سیرافی نے مختلف اقوال کے مطابق بیس تا تیس سال کی عمر میں عمان کا سفر (۸) کیا، اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہ کر کئی بڑے حنفی فقہا سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، ان کے علاوہ دو شافعی محدثوں: شیخ ابو عبید علی بن جسن حربویہ (متوفی ۳۲۹ھ) اور شیخ ابو بکر عبیداللہ بن محمد بن زیاد واصل (متوفی ۳۱۴ھ) سے علم حدیث پڑھا۔ پھر عسکر جا کر معتزلی متکلم محمد بن عمر صیمری (متوفی ۳۱۵) سے استفادہ کیا۔ صیمری معتزلہ کے بڑے امام تھے۔ ابو علی جبائی کے بعد معتزلہ کے سرخیل یہی سمجھے جاتے تھے۔(۹)

اساتذہ: ابوسعید سیرافی نے اپنے عہد کے متعدد کبار علماء سے استفادہ کیا اور ائمۂ فن سے مختلف فنون حاصل کیے۔ ان کے چند اساتذہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ابو اسحاق ابراہیم بن السری (۲۳۰ تا ۳۱۱ھ) نحوی انہیں امام مبرد کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ ''الکتاب'' پر بھی ان کا کام ہے۔ انہوں نے اور بھی کئی کتابیں لکھی تھیں۔ سیرافی نے ان سے ''فصیح ثعلب'' اور قوافی (لأبی عمر الجرمی) روایت کی ہے۔

۲۔ ابو عبداللہ ابراہیم بن محمد بن عرفہ معروف بہ ''نفطویہ'' مشہور نحوی ہیں۔ انہیں متعدد علوم وفنون میں مہارت تھی۔ سیرافی نے ان سے أخبار النحویین میں ایک روایت کی ہے۔

۳۔ شیخ القراء ابو بکر احمد بن حوسی بن عباس بن مجاہد معروف بہ ''ابن مجاہد'' قرائے سبعہ میں سے ہیں۔ ان سے سیرافی نے قرأت کی تعلیم حاصل کی ہے۔ یونس نحوی، کسائی نحوی ابو عبیدہ لغوی اور امام مبرد کی روایتیں سیرافی کو ان سے پہنچی ہیں۔

۴۔ ابو علی اسماعیل بن محمد بن اسماعیل الصنار (متوفی ۲۴۷ھ تا ۳۴۱ھ) ان سے اَخبار النحویین میں پانچ روایتیں منقول ہیں۔

۵۔ ابو علی حسین بن قاسم بن جعفر کوکبی (متوفی ۳۲۸ھ) ادیب و اخباری تھے۔ ''اخبار النحویین البصریین'' میں ان سے ایک روایت ہے۔

۶۔ عبید اللہ بن عبد الرحمن السکری (متوفی ۳۲۳ھ) اخباری اور ادیب تھے۔

۷۔ کاتب ابو عبد اللہ محمد بن سہل: ایک روایت ان سے بھی مروی ہے۔

۸۔ ابو بکر محمد بن السری معروف بہ ابن السراج بڑے نحوی تھے انہیں لغت اور شعر و ادب میں بھی مہارت تھی فن نحو میں انہوں نے کئی مفید اور اہم کتابیں لکھی تھیں۔ سیرافی نے ان سے ''الکتاب'' (سیبویہ متوفی ۱۸۰ھ) پڑھی تھی۔

۹۔ ابو احمد محمد بن احمد جریری (متوفی ۳۲۵ھ) نحوی، ادیب اور اخباری تھے۔ ان سے بھی ایک روایت ہے۔ ''اخبار النحویین البصریین'' میں ایک جگہ سیرافی نے ان کی تحریر کو بطور استشہاد پیش کیا ہے۔

۱۰۔ مبرمان: ابو بکر محمد بن علی بن اسماعیل معروف بہ ''مبرمان'' (متوفی ۳۲۶ھ) فن نحو کے بڑے امام تھے۔ انہوں نے فن نحو میں کئی کتابیں بھی لکھی تھیں، ان سے سیرافی، ان کے مشہور معاصر ابو علی فارسی اور ان دونوں کے ہم طبقہ حضرات نے علم حاصل کیا۔ (۱۰)

۱۱۔ ابو بکر محمد بن حسن معروف بہ ابن درید شاعر، ادیب اور نحوی تھے۔ جمہرۃ انساب العرب ان کی عمدہ تصنیف ہے۔

سیرافی اور ان کے صاحب زادے دونوں ان کے شاگرد ہیں۔ سیرافی نے ان سے علم لغت پڑھا ہے۔

۱۲۔ ابو بکر محمد بن قاسم معروف بہ ''ابن الانباری'' (۲۷۱ھ تا ۳۲۸ھ) ادیب، نحوی، قاری اور محدث تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان سے سیرافی نے یعقوب بن سکیت کی ''اصلاح المنطق'' روایت کی ہے۔

۱۳۔ ابو بکر محمد بن مزید معروف بہ ابن ازہر سے بھی سیرافی نے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ''اخبار النحویین البصریین'' میں ان سے چار روایتیں مذکور ہیں۔

۱۴۔ محمد بن عبدالواحد معروف بہ ''مطرز'' اور معروف بہ ''غلام ثعلب'' (۲۶۱ھ تا ۳۴۵ھ) سے سیرافی نے ''فصیح ثعلب'' روایت کی ہے۔

۱۵۔ ابومزاحم موسی بن عبداللہ خاقانی (متوفی ۳۲۵ھ) قاری اور محدث تھے۔ سیرافی نے ''اخبار النحویین البصریین'' میں ان سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں۔(۱۱)

سیرافی کے مذکورہ چند اساتذہ ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرافی کو ائمہ فن اور اساطین علم سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ سیرافی کے دیگر اساتذہ کا تذکرہ اختصاراً ترک کر کے ان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

تلامذہ: سیرافی کو تعلیم و تعلم سے بڑا گہرا شغف تھا۔ چنانچہ عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گذرا، جس کے نتیجے میں ان کے بہت سے شاگرد ہوئے، جن میں چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:

۱۔ **ابواسحاق:** ابراہیم بن سعید بن طیب (متوفی ۴۲۲ھ) انہوں نے سیرافی سے ''الکتاب'' کی شرح (لابی سعید نفسہ) پڑھی۔

۲۔ **ابواسحاق:** ابراہیم بن علی فارسی، انہوں نے سیرافی سے خوب استفادہ کیا ہے۔

۳۔ **ابوطالب:** احمد بن بکری عبدی (متوفی ۴۲۲ھ)۔

۴۔ **احمد بن عبدالرحمان حبسی:** انہوں نے سیرافی کی ''اخبار النحویین البصریین'' روایت کی ہے۔

۵۔ **ابوعبداللہ:** حسین بن محمد بن جعفر الخالع (متوفی ۴۲۲ھ)۔

۶۔ **ابن خالویہ:** ابوعبداللہ حسین بن محمد بن خالویہ (المتوفی ۳۷۰ھ) انہوں نے اگرچہ سیرافی کے معاصر ابو علی فارسی سے بھی پڑھا مگر ''قفطی'' کے بقول ان کا رجحان ابو علی فارسی کے مقابلے میں سیرافی کی طرف تھا۔

۷۔ **ابوالعلاء:** صاعد بن حسن بن عیسیٰ بغدادی (متوفی ۴۱۰ھ) انہوں نے سیرافی سے ''الکتاب'' اور ''اصلاح المنطق'' پڑھی۔

۸۔ **طلحہ بن کردان نجدی:** یہ سیرافی کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔

۹۔ **ابومحمد:** عبداللہ بن جمود زبیدی اشبیلی (متوفی ۳۷۲ھ) یہ صاحب ''طبقات النحویین والکوفیین'' ابو بکر محمد بن حسن زبیدی کے چچازاد بھائی تھے۔ سیرافی کی وفات کے بعد انہوں نے ابو علی فارسی سے بھی پڑھا، ابو علی جہاں قال الاندلسی اور سالنی الاندلسی فرماتے ہیں وہاں یہی مراد ہوتے ہیں۔

۱۰۔ **ابن جماعۃ:** عزالدین بن ابو بکر معروف بہ ابن جماعۃ مختلف علوم و فنون میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ دیار مصر کے نامور اور باکمال عالم تھے۔ انہوں نے بھی سیرافی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی تصانیف

ایک ہزار سے زائد ہیں۔(۱۲)

۱۱۔ابوالحسن: علی بن عیسی الربعی (۳۲۸ھ تا ۴۲۰ھ) انہوں نے سیرافی سے فن ادب پڑھا ہے، نیز ''الکتاب''اور ابن السراج کی ''الاصول'' بھی پڑھی ہے۔

۱۲۔ابوحیان توحیدی: علی محمد بن عباس (المتوفی ۴۰۰ھ) یہ سیرافی کے اہم ترین شاگرد ہیں، انہوں نے سیرافی سے ''شرح کتاب سیبویہ'' پڑھی تھی۔ سیرافی کے تعارف اور مناقب میں جو کچھ ابوحیان توحیدی نے کہا ہے وہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، انہوں نے اپنے شیخ سیرافی کا امام کی حیثیت سے تعارف کرایا ہے۔ نیز ''الامتاع والموانسہ'' میں شیخ سیرافی کے تفصیلی حالات ذکر کیے ہیں۔

۱۳۔ابن ندیم: ابوالفرج محمد بن اسحاق المعروف بہ ابن الندیم (متوفی ۴۳۸ھ)۔ ابن الندیم سیرافی کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں، ان کی الفہرست لابن الندیم محتاج تعارف نہیں۔

۱۴۔ابوالعباس محمد بن عبداللہ نحوی: معروف بہ ابن ورّاق (متوفی ۳۱۸ھ)۔ ابن وراق کئی قیمتی کتابوں کے مصنف اور مشہور نحوی ہیں۔ امام سیرافی کے داماد بھی ہیں۔

۱۵۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد زہری اندلسی (متوفی ۶۱۷ھ)۔ یہ ادیب نحوی، لغوی اور محدث تھے۔ انہوں نے کئی قیمتی کتابیں تصنیف فرمائیں تھیں۔ جیسے شرح الایضاح لابی علی الفارسی فی النحو (۱۵ جلدیں)، شرح المقامات، اقسام البلاغۃ واحکام الصناعۃ (دو جلدیں)۔(۱۳)

۱۶۔ ابوعبداللہ محمد بن محمد (متوفی ۴۳۴ھ)۔ علم قرأت اور فن رو کے شناور ہیں۔ انہوں نے بھی کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ انہوں نے سیرافی سے فن نحو پڑھا تھا۔(۱۴)

تصانیف: ابوسعید سیرافی نے زبان و قلم دونوں سے یکساں طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی کتابیں علمی دنیا میں بہت مقبول ہوئیں، مثال میں صرف سیرافی کی کتاب سیبویہ کی شرح، الکتاب کا نام ہی کافی ہے۔

شرح کتاب سیبویہ: شرح کتاب سیبویہ، علم نحو کا قابل افتخار سرمایہ ہے۔ مصنفین و محققین اس شرح سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ خاص طور پر متقدمین علمائے نحو: ابن یعیش کی المفصل اور فارقی کی ''شرح اللمع'' کے بارے میں متقدمین کا کہنا ہے کہ انہوں نے بکثرت سیرافی کی اس شرح سے استفادہ کیا ہے۔(۱۵)

سیرافی کے شاگرد رشید ابوحیان توحیدی اس شرح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بعض لوگوں نے (۱۶) سیرافی کی شرح الکتاب پر تنقید کرکے اس میں خامیاں نکالنی چاہیں اور اس کا رد لکھنا چاہا، مگر ان کا زور صرف سیرافی پر طعن و تشنیع کرنے تک تھا۔ بالآخر ان کے پاس سرِ تسلیم خم کردینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔(۱۷)

شرح الکتاب کے بارے میں ایک جگہ یاقوت حموی لکھتے ہیں:

شرح الکتاب تقریباً تین ہزار اوراق پر مشتمل ہے۔(جو آج کل رائج طرز کے حساب سے تقریباً تیس جلدوں میں آئے گی)۔الکتاب کا کوئی دوسرا شارح، سیرافی کے قریب بھی نہیں ہے۔ان کی یہ شرح متفقہ طور پر الکتاب کی سب سے اچھی شرح ہے۔اگر ان کے حصے میں کتاب سیبویہ کی شرح کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تو صرف یہ شرح سیرافی کے فضل و کمال کے لیے کافی تھی۔ اس کی شرح کو ایک یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان سے پہلے کسی نے الکتاب کی مکمل شرح نہیں لکھی تھی۔یہ فضیلت بھی اسی شرح کے حصے میں آئی۔(۱۸)

شرح شواہد کتاب سیبویہ: الکتاب میں جو شواہد اور دلائل ہیں، نیز جو آیات و احادیث، آثار و اقوال اور اشعار و امثال وغیرہ بطور استشہاد پیش کیے گئے ہیں، اس کتاب میں ان کی بہترین تشریح کی گئی ہے۔(۱۹)

المدخل الی کتاب سیبویہ: اسے ایک طرح سے شرح الکتاب کا مقدمہ سمجھنا چاہیے۔الکتاب پڑھنے والے کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔انہیں اس میں بیان کیا گیا ہے۔

الاقناع فی النحو: قفطی اور حموی نے تو اس کتاب کی نسبت سیرافی کی طرف ہی کی ہے۔جیسا کہ سیرافی کے صاحبزادے محمد بن یوسف لکھتے ہیں: وضع ابی النحو فی المزابل بالاقناع (یعنی کتابہ الاقناع)۔(۲۰)

لیکن ابوالعلاء نے یہ اضافہ کیا ہے کہ بغدادیوں کے بقول سیرافی نے اپنی مشہور کتاب ''مقنع یا اقناع'' باب تصغیر تک لکھی تھی۔ان کی وفات کے بعد اسے ان کے صاحبزادے ابو محمد یوسف نے پورا کیا۔(۲۱)

الفات الوصل والقطع: یہ کتاب بھی مفصل ہے۔چنانچہ قفطی لکھتے ہیں کہ الفات الوصل والقطع تین سو اوراق پر مشتمل ہے۔

کتاب الوقف والابتداء: یہ کتاب فن قرأت میں ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔

کتاب صنعۃ الشعر والبلاغۃ: ابن ندیم اور یاقوت نے اس کو سیرافی کی مصنفات میں ذکر کیا ہے۔

شرح مقصورۃ ابن درید۔جزیرۃ العرب۔شرح اصلاح المنطق۔کتاب الاغراب فی الاعراب۔

اخبار النحویین البصریین: اس کتاب میں نحات بصرہ کے تراجم و طبقات کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں سیرافی نے اپنے اساتذہ تک تمام نحات بصرہ کو بڑی خوش اسلوبی اور استناد کے ساتھ بیان کیا ہے۔بیان احوال میں فرق مراتب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔یہ کتاب جتنی مختصر ہے اتنی ہی مستند ہے۔(۲۲)

مسلک: شیخ سیرافی اہل سنت والجماعت میں سے حنفی المسلک تھے۔انہوں نے عمان کے متعدد بڑے حنفی فقہا سے علم فقہ اصل کیا تھا۔اور بعد میں جامع ''رصافۃ'' میں تقریباً پچاس سال فقہ حنفی کے مطابق فتاویٰ لکھتے

رہے۔ان کے مذہباً حنفی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے؛ لیکن چونکہ ان کے ایک استاد محمد بن صمیری معتزلی تھے،اس لیے بعض لوگوں نے ان کو معتزلی کہہ دیا ہے۔ جبکہ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے ان سے اعتزال کی نفی کی ہے،یہی صحیح بھی ہے کہ وہ معتزلی نہیں تھے۔(۲۳)

ذوق مناظرہ: شیخ سیرافی میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں، وہیں ان کو زبان و بیان میں مہارت، منطقی انداز میں بات کو ثابت کرنے کا ملکہ اور فریق مخالف کو زیر کرنے کی زبردست قدرت عطا ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ علمی گہرائی و گیرائی مہمیز کا کام کرتی تھی۔ جب وہ کلام کرتے تو لوگ حیران و ششدر رہ جاتے۔ چنانچہ انہوں نے بارہا مد مقابل کو شکست دے کر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ان کے دو مناظرے مشہور ہیں۔

۱۔وزیر ابوالفتح فضل بن جعفر بن فرات کے دربار میں ۳۲۰ھ میں ایک مناظرہ متی بن یونس سے ہوا جس میں وقت کے بہت سے بلند پایہ علماء موجود تھے۔ جیسے :ابوبشر،ابن رباح،ابن کعب،ابوعمرو قدامہ بن جعفر،زہری، علی بن عیسی نحوی،ابوفراس،ابن رشید،ابن عبدالعزیزالہاشمی،ابن یحییٰ علوی،رسول بن طغج مصری اور مرزبانی وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ متی بن یونس کہتا تھا کہ حق و باطل، صدق و کذب اور خیر و شر میں امتیاز کرنے والی چیز صرف منطق ہے۔ منطق ہی کے ذریعہ حق کی معرفت ہوسکتی ہے۔ منطق سے علوم کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

وزیر نے دربار میں علما سے کہا کہ کوئی متی بن یونس سے مناظرہ کرکے حق واضح کرے۔ مجلس میں سے کوئی کھڑا نہیں ہوا جب وزیر نے دوبارہ کہا اور علما کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا تو سیرافی کھڑے ہوئے اور متی بن یونس فلسفی کو شکست دی۔

اس مناظرے کی روداد علی بن عیسی نحوی نے قلم بند فرمائی۔ تفصیل کے لیے ''الامتاع والمونسۃ لابی حیان توحیدی'' ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ابوالفتح ابن العمید کے دربار میں ۳۶۴ھ میں فلسفی ابوالحسن عامری نیشاپوری سے بھی سیرافی کا ایک مناظرہ ہوا تھا۔ جس میں سیرافی نے انہیں شکست دی تھی۔(۲۴)

درس وتدریس اور فتوی نویسی: سیرافی کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی لوگ مل کر جتنا کام کرتے ہیں وہ اکیلے ہی اتنا کام کر گئے۔ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہوں۔ وہ بیک وقت محدث، قاضی، فقیہ، قاری، متکلم، لغوی، نحوی، شاعر، مہندس، ماہر علم الفرائض اور حساب داں تھے اور انہوں نے یہ سارے علوم پڑھائے بھی تھے۔ وہ روزانہ بہت سے اسباق پڑھاتے تھے۔ سیرافی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے جامع رصافہ میں پچاس سال فقہ حنفی کے مطابق فتاوی لکھے جن میں کبھی ان کی کوئی غلطی یا لغزش

نظر نہیں آئی۔

عہدۂ قضا: سیرافی اپنے استاذ قاضی ابو محمد بن معروف کے بعد بغداد کے قاضی ہوئے۔ اولاً صرف مشرقی بغداد کے قاضی تھے۔ پھر مشرق و مغرب دونوں اطراف کے قاضی بن گئے۔ آخر میں پھر صرف مشرقی کے قاضی رہے۔ انہوں نے امور قضا کی انجام دہی پر کبھی کوئی اجرت نہیں لی بلکہ لوجہ اللہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔(۲۵)

زہد و عبادت: شیخ سیرافی متدین، پرہیزگار، زاہد و عابد انسان تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن میں تلاوت قرآن کریم اور دوسری ذمہ داریوں میں مصروف رہتے۔ جبکہ رات میں اذکار و نوافل کا شغل رہتا۔ ان کے سامنے جب بھی موت اور مابعد الموت کا تذکرہ ہوتا تو ان پر گریہ طاری ہو جاتا اور کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ سیرافی متقی، پرہیزگار تھے۔ انہوں نے کبھی امور قضا پر اجرت نہیں لی، بلکہ اپنے دست ہنر سے کما کر گذارہ کرتے تھے۔ چنانچہ روزانہ دس اوراق کی کتابت کر کے قضا کی ذمہ داریوں کو انجام دیتے تھے۔ اپنے لکھے ہوئے اوراق فروخت کرتے تھے۔ دس اوراق دس درہم میں بیچتے تھے۔ عبادت کا یہ عالم تھا کہ سیرافی نے چالیس سال یا اس سے بھی زیادہ روزے رکھے۔(۲۶)

سیرافی علماء کی نظر میں: سیرافی کے بارے میں علمائے امت نے بڑے وقیع تبصرے فرمائے ہیں۔ چنانچہ مفسر قرآن ابو حیان توحیدی ''تقریظ الجاحظ'' میں رقم طراز ہیں کہ ابو سعید سیرافی امام الائمہ، بہترین نحوی، فقیہ، لغوی، قاری، محدث، متکلم، شاعر، حساب داں اور مہندس تھے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> .....فقہ، حدیث، عربیت اور قضا میں سیرافی مرجع خلائق تھے۔ وہ معتدل مزاج اور میانہ رو انسان تھے۔ کئی بادشاہ ان کو تعظیمی خطوط لکھتے اور مسائل دریافت کرتے تھے۔ ان سے ایک سرکاری عہدہ قبول کرنے کی فرمائش ہوئی تو سیرافی باز رہے اور فرمایا کہ اس کام کے لیے بڑی جرأت و جسارت اور سیاست کی ضرورت ہے اور یہ دونوں چیزیں میرے اندر نہیں ہیں۔

سیرافی کے بارے میں ابن فرات لکھتے ہیں: قاضی ابو سعید سیرافی بے مثال عالم و فاضل تھے۔ خاص طور پر علم نحو میں ان کی نظیر نہ تھی۔(۲۷)

سیرافی کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے نوازا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چھوٹا، بڑا ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان کے اساتذہ بھی ان کو بڑی اہمیت دیتے تھے جیسے شیخ تقی الدین شمنی، صیمری، فقیہ کرخی، رئیس الرؤساء ابوالقاسم علی بن حسن وغیرہ ان سے خصوصیت کا معاملہ فرماتے تھے۔(۲۸)

معاصرین کے درمیان سیرافی کا مقام: معاصرین ہر کامیاب انسان سے مقابلہ آرائی کرتے رہے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ معاصرت میں عموماً منافقت پیدا ہو ہی جاتی ہے، لیکن مستقل مزاج اور یکسو انسان اس نازک وادی

کو بخوبی قطع کر کے کامیابی کے منازل طے کر لیتا ہے، جبکہ یہی چیز کچھ لوگوں کے لیے پیر پھسلنے کا سبب بن جاتی ہے۔

شیخ سیرافی سے سب سے زیادہ منافرت اور منافست رکھنے والے معاصر شیخ ابو علی فارسی (۲۹) ہیں جنھوں نے سیرافی کی ''شرح الکتاب'' کا رد لکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان کے علاوہ سیرافی کے ہم عصر علما میں علی بن عیسی رمانی، ابن اطراغی، ابن شاذان، ابن وراق اور ابن حیوہ وغیرہ تھے۔ ابوسعید ان سب میں فائق تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: معجم الادبا (ج: ۲، ص: ۸۸۸-۷۹۳)

وفات: یہ آفتاب علم و عرفان تقریباً ۸۴ سال میں بروز پیر، قبل العصر، ۲، رجب ۳۶۸ھ میں غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کا سن وفات ۳۶۴ھ ہے جبکہ دوسری روایت کے مطابق ۳۶۵ھ ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

سیرافی کی وفات طائع باللہ بن محمد مطیع اللہ کے دور خلافت میں بغداد میں ہوئی۔ اور تدفین مقام خیزران کے قبرستان میں ہوئی۔ (۳۰)

مرثیے کے چند اشعار: ان کی وفات پر رضی موسوی نے ان کا مرثیہ لکھا تھا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں:

لم ینسنا کافی الکفاۃ مصابہ حتی دھانا فیك خطب مضلع

قرح علی قرح تقارب عھدہ ان القروح علی القروح لاوجع

وتلا حسن الفضلاء اعدل شاھد ان الحمام بکل علق مولع

اخبار النحویین البصریین؛ تعارف و تبصرہ: نحو اور نحات پر متنوع طریقہ سے بہت کچھ لکھا گیا ہے چنانچہ کچھ معاجم میں طبقات نحات کو سنین وفات کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے؛ جبکہ کچھ کتابوں میں تراجم نحات حروف تہجی کی ترتیب پر لکھے گئے ہیں۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اولاً ''محمدین'' اور ''احمدین'' کو جمع کیا ہے۔ اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔

اس سلسلے کی چند اہم اور قابل ذکر کتابیں ترتیب زمانی کے حساب سے درج ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلے محمد بن یزید معروف بہ امام مبرد نے نحات کے حالات پر کتاب لکھی تھی جو اب تک کی دستیاب کتابوں میں سب سے پرانی ہے۔

۲۔ **مراتب النحویین:** لابی الطیب عبدالواحد بن علی الحلبی اللغوی (متوفی ۳۵۱ھ)۔ ۱۳۷۵ھ میں محمد ابوالفضل ابراہیم مصری کی تحقیق سے دار نہضۃ مصر، قاہرہ سے اس کی اشاعت ہوئی۔

۳۔ **اخبار النحویین البصریین:** للقاضی ابی سعید سیرافی (متوفی ۳۶۸ھ)۔ اس کتاب کو سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں مستشرق محقق فریٹز کرنکو (۱۸۷۲۔۱۹۵۳) نے قلمی مخطوطے کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا۔

۴۔ **طبقات النحویین واللغویین:** لابی بکر محمد بن حسن بن عبداللہ زبیدی اندلسی (المتوفی ۳۷۹ھ یا ۳۸۰ھ)۔ محمد ابوالفضل ابراہیم ہی نے ۱۳۷۳ھ میں یہ کتاب بھی شائع کی۔ یہ بھی اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

۵۔ ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن درستویہ نے ایک کتاب لکھی، یہ بھی قیمتی کتاب رہی ہو گی۔ ہمیں یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی اور نہ ہی نام معلوم ہو سکا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

۶۔ ابو عبداللہ محمد بن عمران مرزبانی نے "المقتبس فی اخبار النحاۃ والادباء والشعراء والعلماء" کے نام سے ۱۹؍ جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب لکھی۔ اس میں ضخامت کے باوجود تراجم کی کثرت نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں تراجم بہت لمبے ہیں۔ ابو عبداللہ مرزبانی کا یہ کارنامہ چوتھی صدی ہجری کا ہے۔ یہ کتاب مطبوع نہیں ہے۔ اس کا تین مرتبہ اختصار کیا گیا ہے، جس کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ "المنتخب" یہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا جو موجود نہیں ہے۔ ۲۔ "المختار" یہ بھی ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا، یہ موجود ہے۔ ۳۔ اصل کتاب "المقتبس" اور "المنتخب" کو ملا کر "نور القبس" کے نام سے اختصار کیا گیا۔ یہ اختصار ابوالمحاسن یوسف ابن احمد یغموری نے ساتویں صدی کے نصف اول میں لکھا اور دارالنشر / فرانس، شتاینز، وائسباڈن سے مستشرق روڈولف زلہایم کی تحقیق سے ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ (۳۱)

۷۔ **تاریخ العلماء النحویین من البصریین والکوفیین وغیرہم:** للقاضی مفضل بن محمد بن مسعر (متوفی ۴۴۲ھ)۔ ڈاکٹر عبدالفتاح الحلو کی تحقیق سے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں ادارۃ الثقافۃ والنشر بجامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض سے اس کی اشاعت ہوئی۔

۸۔ **شجرۃ الذہب فی اخبار اہل الادب:** لعلی بن فضال مجاشعی، اس کتاب پر یاقوت حموی نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

وجدته كثير التراجم قليل الفائدة لكونه لا يعنى بالأخبار ولا يعبأ بالوفيات والأعمار (میں نے پایا کہ اس میں سوانح عمریاں بہت ہیں لیکن ان کا فائدہ کم ہے کیونکہ ان کو خبروں سے دلچسپی نہیں ہے اور سال وفات اور عمر کے بارے میں بھی ان کی توجہ نہیں ہے)۔ یہ

کتاب عام طور پر دستیاب نہیں ہے۔

۹۔ نزہۃ الألباء فی طبقات الأدباء أی النحاۃ: لابی البرکات عبد الرحمن بن محمد الأنباری (المتوفی ۵۷۷ھ) اپنے موضوع پر یہ شاندار کتاب ہے، اس میں ابن الانباری نے ۴۸۵ نحات کا تذکرہ کیا ہے۔ سب سے آخر میں ''ابن الشجری'' متوفی ۵۴۲ھ کے حالات ہیں۔ یہ کتاب دار الفکر العربی، قاہرہ سے ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء میں ابوالفضل ابراہیم ہی کی تحقیق سے شائع ہوئی۔

۱۰۔ إنباہ الرواۃ علی أنباء النحاۃ: للوزیر جمال الدین ابی الحسن علی بن یوسف القفطی (المتوفی ۶۲۴ھ)۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں ۹۷۶/ نحات کے سوانحی حالات درج ہیں، استاد محمد ابوالفضل ابراہیم ہی کی تحقیقات سے ۱۳۶۹ھ سے ۱۳۸۰ھ کے درمیان مختلف مرحلوں میں دار الفکر العربی، قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۱۱۔ إشارۃ التعیین وتراجم النحاۃ والنحویین: لعبد الباقی بن عبد الحمید کافی (۶۸۰ھ تا ۷۴۳ھ)۔ اس کتاب میں چوتھی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے ۲۴۶ نحات کا تذکرہ ہے۔ عبدالباقی کافی نے اپنی کتاب کی ابتدا احمد بن ابراہیم شیبانی (المتوفی ۲۹۷ھ) کے حالات سے اور اختتام عبداللہ بن ہشام بن یوسف (متوفی ۷۶۱ھ) پر کیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر عبدالمجید دیاب کی تحقیق سے مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ سے ۱۴۰۶ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔

۱۲۔ البلغۃ فی تراجم ائمۃ النحو واللغۃ: للعلامہ مجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب بن محمد ابراہیم فیروزآبادی (المتوفی ۸۱۷ھ)۔ اس میں ۴۲۴ نحات ولغویین کا تذکرہ ہے۔ ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء میں محمد المصری کی تحقیق سے دار سعد الدین سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

۱۳۔ طبقات النحاۃ واللغویین: للعلامہ تقی الدین ابو بکر بن احمد بن محمد اسدی شہبی المعروف بہ ابن قاضی شہبہ (۷۷۹ھ تا ۸۵۱ھ)۔ یہ کتاب طبقات ابن قاضی شہبہ کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر محسن غیاض کی تحقیق سے مطبوعۃ النعمان، نجف سے شائع ہوئی۔

۱۴۔ بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ: للعلامہ جلال الدین سیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ)۔ یہ پہلی بار ۱۳۲۶ھ میں شیخ احمد بن امین شنقیطی کی تحقیق سے مطبعہ عیسی البابی الحلبی/ مصر سے شائع ہوئی۔ تراجم نحات پر ان کے علاوہ بھی کتابیں لکھیں گئیں ہیں، قریبی زمانے میں بھی ''المدارس النحویۃ اور النحو والنحاۃ'' وغیرہ لکھی گئیں۔(۳۲)

اخبار النحویین البصریین: ''اخبار النحویین البصریین''کو مصنفین واصحاب معاجم نے مختلف ناموں سے ذکر کیا ہے، چنانچہ تاریخ بغداد (ج:۸،ص:۵۷) اور الانباہ (ج:۱،ص:۳۴۹) میں اس کا نام اخبار النحاۃ ہے۔ روضۃ الجنات (ج:۳،ص:۲۷) میں اخبار النحاۃ البصریین؛ الفہرست میں ''اخبار النحویین''؛ اور وفیات الاعیان، بغیۃ الوعاۃ اور معجم الادباء میں اخبار النحویین البصریین کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کی محقق اشاعتیں: اخبار النحویین البصریین اب تک کئی محققین کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے:

۱۔پہلی مرتبہ: ۱۹۳۶ء میں جاپانی مستشرق اسکالر فریتس کرنکو (۱۸۷۲ء۔۱۹۵۳ء) نے بیروت کے کیتھولک مکتبے سے شائع کی۔

۲۔دوسری مرتبہ: ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں مصطفی البابی حلبی کے مطبع واقع قاہرہ سے اساتذۂ جامعہ ازہر ڈاکٹر طٰہٰ محمد زینی اور ڈاکٹر عبدالمنعم خفاجی کی تحقیق سے شائع ہوئی۔

۳۔تیسری مرتبہ: ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں مکتبہ دارالاعتصام/مصر سے ڈاکٹر ابراہیم البنا کی تحقیق سے شائع ہوئی۔ جس میں چھوٹی تقطیع کے ۱۵۶ صفحات ہیں، شروع میں محقق کی طرف سے ۱۸ صفحات پر مشتمل طویل معلوماتی اور تحقیقی مقدمہ ہے، جس میں مصنف کی زندگی سے سیر حاصل بحث کرنے کے علاوہ سابقہ محققین کی تحقیقات کا بھی ذکر ہے، ڈاکٹر محمد ابراہیم البنا نے کتاب کے دو مخطوطوں پر اعتماد کیا ہے، ایک قاہرہ میں ہے اور دوسرا مکہ میں ہے جو مکمل نہیں ہے۔ (یہ دونوں نسخے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔) ڈاکٹر ابراہیم نے شخصیات اور رواۃ کا مختصر تعارف پیش کرنے کا التزام کیا ہے، نیز اشعار وغیرہ کے مراجع کے حوالے بھی درج کیے ہیں، آخر میں مختلف طرح کی فہرستیں درج کی ہیں، جن میں اولاً آیات قرآنیہ، احادیث شریفہ کی فہرست ہے، اس کے بعد اشعار کی فہرست بحر کی تعیین کے ساتھ ہے، پھر اعلام، قبائل و جماعات اور اماکن وبلدان کی فہرست ہے۔

۴۔مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ نے علماء کی ایک جماعت کی تحقیق سے شائع کی، نیٹ پر صرف اس کا سرِ ورق دستیاب ہو سکا ہے۔

۵۔مرکز تراث البصرہ سے شیخ رافد الفتال کی تحقیق سے بھی یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۳۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اس ایڈیشن میں محقق نے واقعی تحقیق و تطویل سے کام لیا ہے۔ نیٹ پر صرف اس کا سرورق دستیاب ہے۔

مختلف قلمی نسخے: کتاب کے دو ہی مخطوطے پائے جاتے ہیں:

ایک مخطوطہ مکتبہ شہید اندراج نمبر ۱۸۴۲، کا عکس جو معہد المخطوطات العربیہ قاہرہ میں ہے۔ یہ

مخطوطہ ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے، جو خط کوفی جلی میں لکھا ہے۔ کرنکو نے اسی مخطوطے کو بنیاد بنا کر شائع کیا ہے۔
دوسرا مخطوطہ مرکزالبحث العلمی بجامعۃ ام القری مکہ مکرمہ میں ہے جو مکمل نہیں ہے۔

ترتیب کتاب: قاضی ابوسعید سیرافی نے اولاً وضع وتدوین نحو کے اسباب پر کلام کیا ہے۔ اس سلسلے میں وارد مختلف روایتیں بیان کی ہیں۔ اس کے بعد درجہ بہ درجہ دوسری اور تیسری صدی کے اعلام نحات بصرہ کو بیان کیا ہے۔ اعلام سے بحث کرنے میں ان کے مراتب کا خیال کیا ہے۔ ایک خاص چیز جو سیرافی کے یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ ''اخذ بعضہم عن بعضہم'' کو خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مثلاً: اس طرح بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے کن سے استفادہ کیا ہے اور ان کے رفقاء میں کون زیادہ ماہر ہوئے یا مثلاً فلاں کے شاگردوں میں کون زیادہ باکمال ہوا۔

بہت سے علماء ایسے ہوئے ہیں جو ایک سے زائد فنون میں شہرت رکھتے ہیں۔ نحات بصرہ میں بھی ایسی ہستیاں تھیں، جو فن نحو کے ساتھ ساتھ لغت وشعر وغیرہ میں بھی مہارت کی حامل تھیں۔ ایسے اعلام کو سیرافی نے مستقل عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

سیرافی سے پہلے نحات بصرہ کے تراجم پر ابوالعباس مبرد نے کتاب لکھی تھی۔ انہوں نے اپنے شیخ مازنی تک کی شخصیات کے تراجم لکھے تھے۔ سیرافی نے اس سے خوب استفادہ کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ شیخ سیرافی نے امام مبرد تک تفصیل سے کلام کیا ہے اور امام مبرد کے بعد ان کے تلامذہ کے تراجم کو بھی مختصراً بیان کر دیا ہے۔

مصنف کا طرز کلام: امام سیرافی تراجم پر لکھی جانے والی کتابوں کی طرح نام، پیدائش، وطن، تعلیم و تدریس اور تصنیف وغیرہ سے وفات تک کی ترتیب نہیں اختیار کرتے، بلکہ ان کا انداز بحث تحلیل و تجزیہ والا ہے۔ وہ روایات وآثار بیان کرتے ہیں۔ علمی مرتبہ اور آثار سے بحث کرتے ہیں۔ نیز بیان طبقات کے ساتھ ساتھ اساتذہ و تلامذہ کا ذکر کرتے ہیں؛ سیرافی نے جتنا لکھا ہے وہ معتبر اور مستند ہے۔ سیرافی نقل وروایات میں اثبت ہیں۔ ان کا اسلوب بیان واضح اور خوبصورت ہے اور ترتیب عمدہ ہے۔

کتاب کے زیادہ ترحصے کا انحصار تو سیرافی کے اساتذہ ابوبکر ابن السراج مبرمان اور ابن درید وغیرہ پر ہے، تاہم امام سیرافی اپنی کتاب میں دو طرح کی عبارتیں لاتے ہیں: ۱۔ نقول ۲۔ روایات۔

''نقول'' سے وہ عبارتیں مراد ہیں جہاں سیرافی صراحتاً یہ لکھتے ہیں: قال ابوالعباس ''محمد بن یزید'' وہ مضمون امام مبرد کی کتاب سے منقول ہوتا ہے اور ''روایات'' وہ حصہ ہے جسے سیرافی اپنے شیخ ابوبکر بن

السراج وغیرہ سے ”عن المبرد وغیرہ“ کے طریق سے بیان کرتے ہیں۔ کتاب میں زیادہ تر نقول ہی ہیں جو مبرد کی کتاب سے مستفاد ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ سیرافی روایات ان مضامین سے متعلق لاتے ہیں جو امام مبرد کی کتاب میں نہیں ہوتے۔

امام سیرافی کی کتاب کا بڑا حصہ امام مبرد کی کتاب سے مستفاد ہے، اس کے باوجود ابومزاحم، ثعلب، ابو حاتم، محمد بن جحم، زجاج اور ابن سراج وغیرہ سے بھی کافی روایات ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ راوی ہیں، جن کو سیرافی کے اساتذہ کی فہرست میں تعداد روایات کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

جس طرح سیرافی نے امام مبرد کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب سے ان کے شاگرد ابن الندیم نے ”الفہرست“ میں خوب استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ابن سلام نے نحات بصرہ کے پہلے پانچ طبقے وہی بیان کیے ہیں جو سیرافی نے ذکر کیے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کتاب ”اخبار النحویین البصریین و مراتبہم واخذ بعضہم عن بعضہم“ پڑھنے اور استفادہ کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں بہت سے لطائف و نکات اور علمی ابحاث بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

حواشی

(۱) کما قال الشعبی: النحو فی کالملح فی الطعام، لایستغنی عنه (الحافظ الخطیب البغدادی ۳۹۲-۴۶۳ھ)، الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع، ج۲/۲۸، تحقیق: د۔ محمود طحان، مکتبہ المعارف، ریاض: ۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء)۔

(۲) من تاریخ النحو العربی، ج/۲۷۔ نشاۃ النحو وتاریخ اشہر النحاۃ ج۱/۲۲۔ نزھۃ الالباء فی طبقات الادباء (۱۴-۱۵)۔

(۳) سیرافی کے حالات کے لیے درج ذیل کتابیں دیکھیں:

محمد بن حسن زبیدی (متوفی ۳۷۹ھ) طبقات النحویین واللغویین (۱۸۵-۱۱۹) تحقیق: ابوالفضل ابراہیم، دار المعارف، مصر۔

محمد بن اسحاق بن ابی یعقوب، ابن الندیم / الفہرست لابن الندیم، ص۶۸، دار المعرفہ، بیروت۔

ابوالبرکات انباری / نزھۃ الالباء فی طبقات الادباء، تحقیق: ابوالفضل ابراہیم، ص۳۲۷، ط: دار الفکر العربی، قاہرہ۔

وزیر جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف قفطی (متوفی ۶۴۶ھ) / انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ (۱/۳۴۲)، بتحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم، ۱۳۶۹ سے ۱۳۸۰ھ کے درمیان مختلف مرحلوں میں دار الفکر، قاہرہ سے شائع ہوئی۔

ابوالعباس شمس الدین احمد بن محمد، ابن خلکان (۶۰۸-۶۸۱ھ)، وفیات الاعیان وانباء انباء الزمان، بتحقیق: احسان عباس، ص (۸۰-۷۸) دار صادر، بیروت۔

علامہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان، ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) سیر اعلام النبلاء، (۱۶/۲۴۷) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

حافظ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان بن ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء) العبر فی خبر من عبر ۳۴۷/۲، بتحقیق: محمد السعید زغلول، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

صلاح الدین خلیل بن ایبک صفدری (متوفی ۷۶۴ھ) الوافی بالوفیات (۴۷/۱۲) بتحقیق: احمد ارناؤوط اور ترکی مصطفی، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔

ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی (متوفی ۵۹۷ھ) المنتظم فی تاریخ الملوك والامم (۲۶۵/۱۴-۲۶۴)، بتحقیق: محمد عبدالقادر عطا اور مصطفی عبدالقادر عطا، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

ابوالفداء حافظ بن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) البدایۃ والنہایۃ (۲۹۴/۱۱) مکتبہ المعارف، بیروت، ۱۴۱۲/ ۱۹۹۱ء۔

خیر الدین زرکلی (۱۳۱۰ھ-۱۳۹۶ھ)/ الاعلام (۱۹۵/۲) دار العلم للملایین، بیروت۔

یاقوت حموی (۶۲۶ھ)/ معجم الادباء (۹۰۹/۲-۸۹۴) بتحقیق: احسان عباس، دار الغرب الاسلامی، بیروت اور مطبع عیسی البابی الحلبی، قاہرہ (۲۰ جلدوں میں)۔

ابوالفلاح شہاب الدین عبدالحیٔ دمشقی/ امام (۱۰۳۲ھ-۱۰۸۹ھ)، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب (۳۶۹/۴-۳۶۷) بتحقیق: عبدالقادر ارناؤوط اور محمود ارناؤوط، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت۔

حافظ جلال الدین بن عبدالرحمن سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)/ بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ (۵۰۹/۱-۵۰۷)، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم، دار الفکر، بیروت۔

عبدالباقی بن عبدالمجید یمانی (متوفی ۱۳۴۲ھ) اشارۃ التعیین فی تراجم النحاۃ واللغویین (۹۳) بتحقیق: ڈاکٹر عبدالمجید دیاب، شرکۃ الطباعۃ العربیۃ السعودیہ۔

تقی الدین ابن قاضی شہبہ (متوفی ۸۵۱ھ)/ طبقات النحاۃ واللغویین، بتحقیق: محسن غیاض، الدار العربیہ للموسوعات، سن: ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۸ء۔

شیخ احمد طنطاوی/ نشاۃ النحو و تاریخ اشہر النحاۃ (۱۹۸)، دار المعارف، قاہرہ۔

ابوحیان حیان علی بن محمد توحیدی، الامتاع والموانسۃ (۱۲۹/۱) المکتبۃ العربیہ، بیروت۔

شہاب الدین احمد بن یحی، ابن فضل اللہ عمری (متوفی ۷۴۹ھ) مسالك الابصار فی ممالك الامصار (۳۰۱/۴)، بتحقیق: کامل سلمانی جبوری، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

علامہ مرزا محمد باقر موسوی خوانساری اصفہانی روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات (۷۰/۳)، الدار الاسلامیہ، بیروت۔

محمد خیر رمضانی یوسف، (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء-۱۴۴۲ھ/ ۲۰۰۳ء)، معجم المولفین المعاصرین (۲۴۲/۳)، مکتبہ الملک فہد، ریاض۔

امام ابو محمد عبداللہ بن اسعد یافعی، یمنی، مکی، (متوفی ۷۶۸ھ)، مرأۃ الجنان وعبرۃ الیقظان (۳۹۰/۲) موسستہ العلمی للمطبوعات،

بیروت۔

علامہ ابو محمد محی الدین عبد القادر قرشی حنفی، شیخ، امام، محدث (۶۹۶-۷۷۵ھ)، الجواهر المضية في طبقات الحنفية (ص: ۲۱۹۶) پہلی طباعت: دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدر آباد۔

ابو المحاسن جمال الدین بردی اتابکی (۸۱۳-۸۷۴ھ)/ النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة (۱۳۳/۴)، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

(۴) بغية الوعاة (ج:۱، ص:۵۰۷) معجم الادباء (ج:۳، ص:۱۲۳) وفيات (ج:۲، ص:۷۷)۔

(۵) الامتاع والموانسة (ج:۱، ص:۱۲۹)، معجم الادباء (ج:۳، ص:۱۲۳)، بغية الوعاة (ج:۱، ص:۵۰۷)۔

(۶) روضات الجنات (ج:۳، ص:۳۷)، بحوالہ آثار البلاد (ص:۲۰۴)، وفيات الاعيان (ج:۲، ص۷۹)۔

(۷) اخبار النحويين البصريين (ص:۸۱)، معجم الادباء (ج:۲، ص:۵۷۷)، روضات الجنات (ج:۲، ص:۱۷)۔

(۸) سیرافی کے عمان جانے کے بارے میں اختلاف ہے، سفر عمان کے وقت سیرافی کی عمر کتنی تھی، اس سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ صاحب فہرست ابن الندیم کے بقول عمان کے سفر کے وقت سیرافی کی عمر ۲۰ سال سے کم تھی۔ (الفهرست، ص:۹۳)

(۹) مقدمہ اخبار النحويين والبصريين (ص:۸) معجم الادباء (ج:۳/ص:۸۷۶) الفهرست لابن النديم (ص ۹۳) بغية الوعاة (ج:۱، ص:۵۰۷) نزهة الادباء (ص:۲۲۸) روضات الجنات (ج:۳/ص:۱۷) وفيات الاعيان (ج:۲، ص۷۹) انباه الرواة (ج:۱/۳۴۸)۔

(۱۰) معجم الادباء (ج:۳/ص۸۷۹) انباه الرواة (ج:۱/ص:۳۱۳)۔

(۱۱) مقدمہ اخبار النحويين والبصريين للڈاکٹر ابراهيم البناء (ص۱۴)۔

(۱۲) تاریخ اشهر النحاة (۲۸۵)۔

(۱۳) بعض لوگوں سے مراد سیرافی کے معاصر ابو علی فارسی وغیرہ ہیں۔

(۱۴) معجم الادباء (۲۷۷/۱۷)، معجم المولفين (۶۷/۳) بغية الوعاة:۱۱۔

(۱۵) معجم الادباء (۳۱/۶-۲۶)۔

(۱۶) انباه الرواة على انباء النحات ج:۱/ص:۲۹۔

(۱۷) معجم الادباء، ج۱۸، ص۱۴۷۔

(۱۸) نزهة الالباء (ص۳۲۸)، معجم الادباء (ج:۸، ص:۱۵۰-۱۵۱)۔

(۱۹) معجم الادباء (ج:۸/ص:۱۴۹)۔

(۲۰) معجم الادباء (ج:۸/ص:۱۴۹) انباه الرواة على انباء النحات ج:۱/ص:۳۱۴۔

(۲۱) رسالة الغفران (ص:۳۵۷)۔

(۲۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے: مقدمۃ اخبار النحویین والبصریین للدکتور ابراھیم (ص:۱۹-۸)، تاریخ الادب العربی (ج: ۲/ ص: ۱۸۸)، الفہرست (ص:۹۳)، وفیات الاعیان (ج:۲/ص:۷۸)، بغیۃ الوعاۃ (ج: ۱/ ص: ۵۰۸-۵۰۷)، نزھۃ الالباء (ص:۲۲۸)، معجم الادباء (ج۲/ص۹۰۰-۸۷۶)۔

(۲۳) **مقدمہ اخبار النحویین والبصریین (ص۸)، معجم الادباء (ج۳/ص۸۷۶)، الفہرست (ص۹۳)، بغیۃ** الوعاۃ (ج:۱/ص:۵۰۷)، نزھۃ الالباء (ص:۲۲۸)، روضۃ الجنات (ج۳/ص۱۷)، وفیات الاعیان (ج۲/ص۷۹)، اس سلسلے میں محمد بن فوارس فرماتے ہیں: کان یذکر عنہ الاعتزال ولم یظھر علیہ شی من ذلک، نزھۃ الالباء (ص۲۲۸)۔

(۲۴) الامتاع والموانسۃ، معجم الادباء (ج۲، ص۹۰۹-۸۹۴)۔

(۲۵) الانباہ (ج۱/ص۳۴۹)۔

(۲۶) بغیۃ الوعاۃ (ص۵۰۸-۵۰۷)۔

(۲۷) نزھۃ الالباء فی طبقات الادباء (۲۲۸)۔

(۲۸) وفیات الاعیان (ج۲/ص۷۹)، **نزھۃ الالباء (ص۲۲۸)**، وفیات الاعیان (ج۳/ص۷۳-۷۲)، انباہ الرواۃ علی انباء النحاۃ (ج۱/ص۳۴۸)۔

(۲۹) شیخ ابوعلی فارسی فسوی (متوفی ۳۷۷ھ) فسانامی شہر میں پیدا ہوئے تھے، حصول علم کے لیے ابن حمدان کے پاس بغداد رہے، پھر شیراز چلے گئے تھے، ابوعلی فارسی مشہور نحوی اور مفسر تھے۔ انہوں نے بہت سی قیمتی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ من جملہ ان کے الکتاب کی شرح بھی لکھی تھی جو مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ شیخ ابوسعید سیرافی کے خاص معاصر تھے۔ ۳۷۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (**ابن ندیم**، ص۶۴) الانباہ (۲۷۴/۱)، معجم الادباء (۱۳/۳)، بغیۃ الوعاۃ (۲۱۷)، وفیات الاعیان (۱۶۴/۱)۔

(۳۰) نزھۃ الالباء (ص۲۲۸)، الانباہ (ج۱/ص۳۴۹)۔

(۳۱) مقدمہ نور القبس، ص۱۱۔ (۳۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مقدمہ در باب اخبار النحویین لاحمد مھدوی رامغانی (ص۲-۱۷)، مقدمہ معجم الادباء، اشارۃ التعیین، مقدمہ طبقات زبیدی اور بغیۃ الوعاۃ وغیرہ۔

مار گولیاتھ، طٰہٰ حسین اور جاہلی شاعری
ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر قمر اقبال

Mob: 9451674108

جاہلی شاعری کا ذکر آتے ہی اس شعری سرمائے کا تصور آجاتا ہے جسے ہم اسلام سے قبل لگ بھگ سوڈیڑھ سو سال پرانا مانتے ہیں۔ اس شعری سرمائے کا کثیر حصہ ان قصائد پر مشتمل ہے جن کی ایک خاص ترکیب ہے۔ قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک اس ادبی میراث کا مطالعہ مختلف جہات سے جاری ہے۔ دنیا کے جس گوشے میں بھی عربی زبان و ادب کی تدریس ہوتی ہے، وہاں اس میراث پر دھیان دیا جاتا ہے۔ دینی درسگاہوں میں بھی مختلف وجوہ سے اسے شامل درس رکھا گیا ہے۔ گو اس میراث میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جس سے نہ صرف مذہبی طبقہ بلکہ عام لوگ بھی کنارہ کشی اختیار کرنا پسند کریں گے، یہ ادبی میراث اعلیٰ پائے کی ہے۔ زبان و فن کے لحاظ سے آج بھی اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ قدماء کے یہاں بھی اس کی زبان و بیان کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا اور آج بھی یہ زیر بحث ہے۔ مستشرقین نے بھی اس پر خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ کوئی اس کا گرویدہ ہو گیا، تو کسی نے اس کی صحت پر ہی سوال کھڑے کر دیے۔ جاہلی شاعری کے کسی بھی مسئلے پر گفتگو نہ تو آسان ہو سکتی ہے اور نہ ہی مختصر۔ صرف قضیہ انتحال کا جائزہ لینے کے لیے پورا ایک دفتر درکار ہوگا، جو نہ تو اس مختصر مقالہ کا موضوع ہے اور نہ مقصد۔ یہاں گفتگو صرف عہد جدید کی دو اہم شخصیتوں: مار گولیاتھ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے درمیان اس قدیم سرمائے کی صحت کے حوالے سے نظریات تک محدود رکھی جائے گی۔

مار گولیاتھ (D.S.Margoliouth) بیسویں صدی کے اہم مستشرق ہیں۔ انگلستان سے ان کا تعلق تھا۔ آکسفورڈ میں بحیثیت پروفیسر انہوں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں(۱) جاہلی شاعری کے مذکورہ قضیہ کے ضمن میں انہوں نے ۳۳ صفحات پر مشتمل ایک طویل مضمون اپریل ۱۹۲۵ء میں قلم بند کیا، جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں مئی میں شائع ہوا۔ زیر بحث جائزہ میں اسی مذکورہ مضمون کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

طٰہٰ حسین کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ نہ صرف عربی ادبیات کے متبحر عالم ہیں، بلکہ خود نوشت

جیسی صنف کی ابتدا بھی عربی میں انہوں نے کی۔ بطور تخلیق کار بھی ان کی حیثیت مسلم ہے۔ لیکن ان کی زیادہ شناخت بطور تنقید نگار ہے (۲)۔ ان کے تفصیلی سوانحی خاکہ سے اجتناب کرتے ہوئے یہاں صرف ان کی مشہور کتاب ''فی الشعر الجاہلی'' کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا شائع ہونا تھا کہ سیاسی، علمی اور دینی تمام حلقوں سے ان پر اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی، جس کے بعد طہٰ حسین نے ضروری حذف واضافہ کے ساتھ ''فی الادب الجاہلی'' کے عنوان سے اس کو شائع کیا۔ اسی مذکورہ کتاب کے ضمن میں عام طور پر تجزیہ نگاروں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ کتاب دراصل مارگولیاتھ کے مضمون کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ ایک تجزیہ نگار کے مطابق ''طہٰ حسین اور بعض مستشرقین نے اس قضیہ کے ضمن میں جو کیا ہے، اس کا موازنہ کیا جائے تو ان میں تقارب بلکہ اتفاق نظر آئے گا، اور یہی چیز اس بات کو عیاں کرتی ہے کہ طہٰ حسین کی گفتگو دراصل مستشرقین کی گفتگو ہے'' (۳) حالانکہ خود مارگولیاتھ نے اپنے ایک مضمون میں، جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا، اس سے انکار کیا ہے۔

قضیہ انتحال: ایسا نہیں تھا کہ عربی ادبیات میں یہ کوئی نیا مسئلہ تھا۔ بلکہ قدماء کے یہاں بھی جاہلی شاعری کی صحت کے حوالہ سے گفتگو ہوئی ہے۔ رواۃ کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے پر بھی تاریخ ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں، خاص طور سے کتاب الاغانی میں اس حوالہ سے بہت سے واقعات درج ہیں لیکن قدماء کے یہاں جو بحث نظر آتی ہے وہ اس عظیم ورثہ کے کچھ مختصر حصوں کو لے کر ہے۔ کسی شاعر کے قصیدہ میں شامل چند اشعار یا پھر چند الفاظ کو لے کر گفتگو ہے اور اس پر سوال ہیں۔ امرؤالقیس کے مشہور معلقہ کے چار اشعار پر یہ سوال قائم ہوا ہے۔ کسی نے اس قصیدہ کے کل اشعار کی تعداد ۷۷ لکھی ہے، تو کسی نے ۹۱ اور کسی نے ۹۲۔ علمی انداز میں سب سے پہلے ابن سلام نے اپنی کتاب طبقات فحول الشعراء میں اشعار کو گڑھنے اور دوسروں کی جانب منسوب کرنے کا مفصل ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہے۔ ایک تو قبائل کا اپنا مرتبہ بلند کرنے کی غرض وخواہش، جس کی وجہ سے یہ عمل پروان چڑھا۔ دوسرے مختلف معاشی وسماجی اسباب کی بنا پر راویوں کے اندر اشعار کو گڑھنا (۴)۔ شوقی ضیف نے تاریخ ادب العصر الجاہلی میں تفصیل سے اس کا جائزہ لیا ہے (۵)۔ گویا یہ قضیہ عربوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔

عہد جدید میں ایک طرف مستشرقین ہیں تو دوسری طرف عرب ادباء۔ مستشرقین میں سب سے پہلے جرمن مستشرق تھیوڈور نولدیک (Theodor Nöldeke) نے ۱۸۶۴ء میں جاہلی شاعری کی صحت پر سوال قائم کیا۔ جرمنی کے ہی ایک اور مستشرق ایریک برونلیچ (Erich Braunlich) نے اس مسئلہ کو اور

ہوا دی۔ لیکن مستشرقین میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو جاہلی شاعری کی صحت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس طبقہ میں اہم نام چارلس جیمس لائل (Charles James Lyall) کا ہے، جنہوں نے مارگولیاتھ کے خیالات کا An Anthology of Ancient Arabic Odes کے مقدمہ میں رد کیا ہے۔(۶)

عہد جدید میں عربوں میں سب سے پہلے مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب تاریخ آداب العرب مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے، لیکن اس میں وہ عرب قدماء کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد طٰہ حسین کی مشہور کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ طٰہ حسین کی کتاب کے رد میں اہم نام مصطفیٰ صادق رافعی (تحت رایۃ القرآن)، محمد فرید وجدی (نقد کتاب الشعر الجاہلی)، محمد الخضر حسین (نقد کتاب فی الشعر الجاہلی) وغیر ھم ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں عام عرب ادباء نے اس کتاب کو رد کیا ہے۔ اردو میں جاوید احمد غامدی کا ایک مفصل مضمون میزان (مارچ ۱۹۹۹ء) میں جاہلی شاعری کے حوالہ سے شائع ہوا ہے۔

مناسب ہے کہ اصل موضوع پر بات کی جائے۔ مارگولیاتھ کے مذکورہ بالا مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مارگولیاتھ نے جاہلی شاعری کا محاکمہ خارجی اور داخلی بنیادوں پر کیا ہے۔ اس کے یہاں پانچ خارجی اسباب ہیں، جن کی وجہ سے اس نے جاہلی شاعری پر سوال کھڑے کیے ہیں۔

۱۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران جو کتبات ملے ہیں، وہ نظم میں نہیں ہیں نثر میں ہیں (۷)۔ بجز چند کے اور سب کا تعلق جنوب عرب سے ہے۔

۲۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ ادب حقیقی ہے تو اس کو محفوظ کیسے کیا گیا؟(۸)

۳۔ ادبی ارتقاء کی تاریخ عام طور پر غیر منضبط سے منضبط کی جانب ہوتی ہے (۹) جبکہ اس معاملے میں ایسا نہیں ہے۔

۴۔ شاعری کے رواۃ عام طور پر ہم جن کا نام لیتے ہیں، وہ غیر ثقہ ہیں۔

۵۔ اسلام جو زمانہ جاہلیت کے تمام شعارات مٹانے کے درپے تھا، اس کے ماننے والوں کی نگاہ سے وہ سرمایہ کیسے محفوظ رہ گیا؟

داخلی اسباب کے ضمن میں اس نے تین نمایاں اسباب کا ذکر کیا ہے:

۱۔ جاہلی شاعری میں ایسے مذہبی شعارات اور علامات ہیں، جن کا تعلق جاہلیت سے نہیں اسلام سے ہے۔ (۱۰) ۲۔ دوسرا سبب زبان ہے۔ یہ تمام قصیدے قرآن کے Dialect میں ہیں (۱۱) جبکہ پورے عرب میں یہ Dialect موجود نہیں تھا۔ ۳۔ قصائد کے موضوع کی یکسانیت بھی ان کی صحت پر سوال کھڑا کرتی ہے۔

ان نکات پر گفتگو کے بعد مارگولیاتھ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جاہلی شاعری مشتبہ ہے۔اس کے لفظوں میں ''ہمارے سامنے جو شہادت مرکزی موضوع سے متعلق ہے وہ قبل اسلام کی شاعری کو مشتبہ بنا دیتی ہے، بلکہ اموی عہد سے پہلے کی تمام شاعری کو'' (۱۲)۔تاہم وہ کوئی فیصلہ نہیں سناتا۔ایک بحث چھیڑ کر وہ فیصلہ سے بچتا ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھتا ہے: ''یہ سوال کہ یہ عربی شاعری زمانہ قدیم سے آئی؟ یا قرآن کے بعد، اس پر فیصلہ معلق رکھنا ہی دانش مندی ہے''۔(۱۳)

مارگولیاتھ نے جو بھی سوالات قائم کیے ہیں، ان سب کا جواب علمائے ادب نے تفصیل سے دیا ہے۔ اس سے صرف نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طٰہ حسین نے جو نکات جاہلی شاعری کے متعلق اٹھائے ہیں، ان کو پیش کیا جائے۔

طٰہ حسین کی مذکورہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ تین حصوں میں ہے۔پہلے حصہ میں جہاں تمہید وطریقہ بحث ہے، وہیں کچھ ذیلی مباحث بھی ہیں۔ دوسرے حصہ میں عرب قبائل کے لہجوں کا اختلاف ہے، پھر شعر گڑھنے کے اسباب وغیرہ پر تفصیلی کلام ہے۔ جبکہ تیسرے حصہ میں مختلف شعراء کا الگ الگ جائزہ ہے۔

جاہلی شاعری پر انہوں نے درج ذیل نکات اٹھائے ہیں:

۱۔زمانہ جاہلی کی تصویر ہمیں قرآن کریم سے ملتی ہے، جس کی صداقت میں ذرہ بھر شبہہ کی گنجائش نہیں، نہ کہ جاہلی شاعری سے۔ ۲۔زمانہ جاہلی کی شاعری کی زبان ہمارے سامنے سوال کھڑے کرتی ہے۔ ۳۔ مختلف قبائل کے لہجات کا فرق بھی سوال کھڑا کرتا ہے۔ ۴۔ پھر رواۃ کا مختلف، غیر ثقہ ہونا اور متعدد اسباب کی وجہ سے شعر گڑھ کر دوسروں کی جانب منسوب کرنا۔ شعر گڑھنے کے متعدد اسباب انہوں نے بیان کیے ہیں مثلاً سیاست، مذہب، شعوبیہ وغیرہ۔

اخیر میں طٰہ کہتے ہیں: ''جہاں تک ہماری بات ہے تو ہم اپنے اس خیال پر مطمئن ہیں کہ جاہلی شاعری یا اس کا اکثر حصہ نہ تو کسی چیز کی نمایندگی کرتا ہے اور نہ ہی کسی چیز پر دلالت کرتا ہے بجز صرف عبث، جھوٹ اور انتحال کے....''۔(۱۴)

طٰہ حسین اور مارگولیاتھ کے نکات پر غور کیا جائے تو بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ طٰہ حسین نے مارگولیاتھ کے زیر اثر اپنی کتاب مرتب کی، نہ صرف زیر اثر بلکہ مارگولیاتھ کے خیالات کو مزید واضح کرتے ہوئے اسی کے نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ خاص طور سے لہجات اور زبان کے عوامل تو بالکل یکساں ہیں۔ دونوں کے نتیجہ بحث میں بھی

اتفاق نظر آتا ہے، لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو دونوں کے یہاں کافی فرق بھی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طٰہٰ حسین بار بار قرآن کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں، جبکہ مار گولیاتھ کا مقصد کچھ اور ہے۔ اپنے پورے مضمون میں اس نے کہیں بھی قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ اسے ایک گمنام عام نثری کتاب سمجھا ہے۔

دوسرے کہ مار گولیاتھ منکر ہے کہ زمانہ جاہلیت میں شاعری نام کی کوئی چیز تھی۔ جبکہ طٰہٰ حسین جاہلیت میں شاعری کے منکر نہیں ہیں۔ مار گولیاتھ عہد اموی تک شاعری کا وجود تسلیم نہیں کرتا، جبکہ طٰہٰ حسین مخضرم دور کی شاعری کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ ایک عرب ناقد کے بقول طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ جاہلی عرب شاعری کے نام پر جو چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں، ان کا اکثر حصہ رواۃ کی وجہ سے مشکوک ہے (۱۵)۔ دوسرے یہ کہ جاہلی شاعری کا بیشتر حصہ آپسی جنگوں کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔ ایک اور فرق ہے طٰہٰ حسین اپنی رائے میں زیادہ مستحکم نظر آتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، جبکہ مار گولیاتھ صرف سوالات ہی قائم کرتا ہے۔

اس سرسری موازنہ کے بعد یہ تو واضح ہے کہ طٰہٰ حسین اور مار گولیاتھ کے یہاں کافی فرق بھی ہے اور یہ صرف فرق ظاہری نہیں بلکہ بنیادی نوعیت کا ہے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ طٰہٰ حسین پر اس کتاب کو لے کر کافی تنقید ہوئی؟ یہ تنقید تین طرف سے ہوئی۔ یعنی دینی، علمی اور سیاسی حلقوں سے۔ سیاست کی کارستانی کچھ زیادہ تھی۔ اس وقت کی وفد پارٹی سے وابستہ لوگ ایک دوسری حریف سیاسی پارٹی ''الاحرار الدستوریین'' سے طٰہٰ حسین کی وابستگی کی وجہ سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے طٰہٰ حسین کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ معاملہ عدالت میں گیا، جہاں سے طٰہٰ حسین بری تو ہوئے لیکن ان کی نوکری جاتی رہی۔

دینی طبقہ کی ناراضگی کی وجہ طٰہٰ حسین کا وہ انداز تھا، جس سے وہ مذہبی عقائد پر نادانستہ چوٹ کر گئے۔ خاص طور سے ان کا یہ لکھنا کہ: ''تورات ہمیں ابراہیم واسماعیل کے بارے میں بتاتی ہے، قرآن شریف بھی ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بتاتا ہے، لیکن ان دونوں ناموں کا تورات اور قرآن میں آجانا، ان لوگوں کے تاریخی وجود کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے'' (۱۶)۔ طٰہٰ حسین کو بھی اس جملہ کی نزاکت کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو فی الادب الجاہلی میں حذف کر دیا۔

دینی اور سیاسی طبقہ کی ناراضگی کا طٰہٰ حسین کو شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنا دفاع بھی کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک انٹرویو میں جو مجلہ ''السیاسۃ'' میں ۲۶ مئی ۱۹۲۶ کو شائع ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اٹھانوے

فیصد ناقدین نے ہماری کتاب ہی نہیں پڑھی ہے۔

جہاں تک علمی طبقہ کے اعتراضات یا طٰہ حسین کے خیالات رد کرنے کا تعلق ہے، تو یہ قابل قدر ہے۔ علم اسی سے آگے بڑھتا ہے۔ طٰہ حسین اور مار گولیا تھ نے جو اعتراضات جاہلی شاعری کی صحت کے حوالہ سے کیے تھے، ان کا تفصیلی جواب بعد کے علماء نے دیا ہے، جن کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے۔

ایک پہلو کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے ربع اول کے آس پاس جس طرح مار گولیا تھ اور طٰہ حسین نے جاہلی شاعری پر سوالات قائم کیے، اس وقت ادب کو تاریخیت کے سانچے میں دیکھے جانے کا رواج ہو چکا تھا۔ ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت تاریخ کے حوالے سے طے کی جاتی تھی۔ فرانس کے ایک مفکر تین(Hippolyte Taine) کا نظریہ اس کے پیچھے کارفرما تھا، جو Historical Criticism کی بات کرتا تھا۔ ادبی تاریخیت بطور ایک تنقیدی اسکول کے اسی کی دین ہے۔ ادبی فن پاروں کی قدر و قیمت متعین کرنے اور ان کی صحت کی جانچ پرکھ کرنے میں طٰہ حسین اور مار گولیا تھ دونوں اسی نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں، جبکہ بعد کے ادبی نظریات بالخصوص اسطوراتی تنقید کا تصور بڑی حد تک ان بیشتر اشکالات کو رفع کر دیتا ہے جو ان دونوں فضلاء نے جاہلی شاعری کے حوالے سے پیش کیے۔ اس ضمن میں سوزان اسٹیٹ کیوچ (Suzanne Pinckney Stetkevych) کی کتاب *The Mute immortals speak* کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے جاہلی شاعری کا ایک اسطوراتی ڈھانچہ میں جائزہ لیا ہے اور نیا مفہوم وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس پوری گفتگو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ طٰہ حسین اور مار گولیا تھ کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ طٰہ حسین قرآن کی حقانیت کے دل سے معترف ہیں، جبکہ مار گولیا تھ کا مقصد ہی شاید یہ تھا کہ وہ جاہلی شاعری پر اپنی گفتگو کے ذریعہ قرآن کی حقانیت پر شبہ پیدا کر سکے۔ ایسا مستشرقین نے کیا ہے۔ مار گولیا تھ اس میں اکیلا نہیں ہے۔ اپنے مضمون کی ابتدا ہی اس نے قرآن میں شعراء کے تذکرہ سے کی ہے اور جابجا قرآن کے حوالے دے کر جاہلی شاعری پر گفتگو کے بہانے کسی اور طرف تیر چلائے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اگر نص Text ہے تو ایک لحاظ سے جاہلی شاعری متبادل نص Anti-text ہے اور ایسا ہونا کچھ بعید بھی نہیں اسی متبادل نص Anti-text کی خرابیوں کو دور کرنے کی غرض سے Text کا نزول ہوا۔

جہاں تک طٰہ حسین کا سوال ہے تو وہ فی الشعر الجاہلی میں ایک مورخ نظر آتے ہیں۔ ادب کے مورخ

نہیں بلکہ عام تاریخ داں جو تاریخ کے اصولوں کو ادب پر چسپاں کرتا ہے، جس کی وجہ سے فن پارہ، ایک تاریخی دستاویز کی شکل لے لیتا ہے، فن پارہ نہیں رہتا یہی فی الشعر الجاھلی کی شکل ہے۔ عالمی ادب میں بھی جب ایسی کوششیں ہوئیں تو ایسے ہی سوالات سامنے آئے۔ ہندوستان میں مہابھارت اور رامائن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

حواشی

(۱) مارگولیاتھ کی حیات کے لیے دیکھیے: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

(۲) طٰہٰ حسین کی حیات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے تاریخ ادب عربی جدید کی کوئی بھی کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔

(۳) محمد بلاسی، قضیۃ الانتحال فی الشعر الجاہلی، ماہنامہ الداعی، مئی-جون ۲۰۱۰ء۔

(۴) ابن سلام، طبقات فحول الشعراء، تحقیق: محمود شاکر، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۲، ص: ۳۹۔

(۵) شوقی ضیف، العصر الجاہلی، دار المعارف، مصر، ۲۰۱۸، ص: ۱۶۴۔

(۶) C.J. Lyall, *An Anthology of Arabian Odes*, Oxford University Press, 1921.

(۷) Margoliouth, *The Origions of Arabic Poetry*, Royal Asiatic Society Journal، مئی-جون ۱۹۲۵، ص: ۴۱۹۔

(۸) ایضاً، ص: ۴۲۳۔

(۹) ایضاً، ص: ۴۲۶۔

(۱۰) ایضاً، ص: ۴۳۶۔

(۱۱) ایضاً، ص: ۴۴۰۔

(۱۲) ایضاً، ص: ۴۴۸۔

(۱۳) ایضاً، ص: ۴۴۹۔

(۱۴) طٰہٰ حسین، فی الشعر الجاہلی، دار المعارف للطباعۃ والنشر، تونس، ۱۹۹۷۔

(۱۵) تفصیل: فی الشعر الجاہلی، تالیف: طٰہٰ حسین، تقدیم ودراسۃ، سامح کریم، الدار المصریۃ اللبنانیہ، ۲۰۱۰۔

(۱۶) طٰہٰ حسین، فی الشعر الجاہلی، ص: ۳۸۔

پروفیسر محمد راشد ندوی

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

Mob:8126236959

استاذ مکرم پروفیسر محمد راشد ندوی (یکم جولائی ۱۹۳۶ء-۷، مئی ۲۰۲۱ء) کا خطۂ مردم خیز بندی اعظم گڑھ سے تعلق تھا۔ خاندان ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح دونوں کے فیوض و برکات سے سرشار رہا ہے۔ ان کے خاندان میں کئی فارغین مدرسۃ الاصلاح رہے ہیں۔ چچا حکیم ادریس اصلاحی صاحب کو اپنی مادر علمی اس قدر پسند آئی کہ خود کو مدرسے کا طبیب قرار دیا اور پوری زندگی مادر علمی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے ضعف کو دیکھتے ہوئے ان کے اہل خانہ انہیں اپنے گھر لے گئے اور وہ محمد آباد گہنہ میں ساحل دریائے ٹونس اپنا مطب کرنے لگے۔ اکثر ان کے مطب پر جاکر حاضری دیتا تو مادر علمی کا ذکر کرتے ہوئے رونے لگتے۔ وہ فرماتے کہ ان اداروں نے ہمارے خاندان کو علم وحکمت سے سرفراز کیا، ہمارا خاندان تین پیڑھیوں سے علم کی خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔ ہمارے والد محترم ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ہمارے بھائی مولوی سعید احمد ندوی (۱۸۹۵-۲۹، دسمبر ۱۹۴۹ء) ایک بڑے عالم دین تھے۔ عربی کے ساتھ عبرانی زبان میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ذمہ داران ندوہ اور مدرسہ دونوں ان پر جان نثار کرتے تھے۔ ابتدائی سالوں میں مدرسۃ الاصلاح میں تدریسی فریضہ انجام دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی ان کے علم و معرفت کے سبب انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ مولانا فراہی کے دروس قرآن میں شرکت کرتے تھے۔ صحف آسمانی کے حوالوں کے سلسلے میں مولانا فراہی ان سے رجوع کرتے تھے۔ یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ جب خود کو مدرسۃ الاصلاح کی تدریسی ذمہ داریوں سے فارغ کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے دو خطوط میں ان کے علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ انہیں فی الفور ندوہ بلایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ندوہ میں اپنی خدمات سے اس کے دانش وارانہ ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ گویا پروفیسر محمد راشد ندوی ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جہاں علم وحکمت کی فضا چھائی تھی۔(۱)

پروفیسر محمد راشد ندوی کا تعلیمی سلسلہ مدرسۃ الاصلاح سے شروع ہوا لیکن اس میں رنگ بھرنے، ایک عالم اور دانشور بنانے کا کام ندوہ نے انجام دیا۔ جہاں انہوں نے عرب و عجم کے اہل علم وادب کا مشاہدہ کیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خصوصی التفات کی بناپر انہیں علمی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوا، اپنی

نشستوں میں ان کے علمی وقار اور فکری جلال کا خوب ذکر کرتے، ان کی عربی انشاء پر کھل کر اظہار خیال کرتے۔ مولانا علی میاں کی تصانیف کے خصائص اور مباحث پر بڑے اعتماد کے ساتھ روشنی ڈالتے۔ رابطے کے پروگراموں میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل ہوتی۔ مولانا علی میاں خود ان کی علمی سرفرازیوں اور عربی دانی کا ذکر کرتے، ان کے مضامین پر خوشی کا اظہار زبانی اور خطوط سے کرتے۔ استاذ محترم اکثر مولانا کے قصوں اور ان کی سادگی کا ذکر کرتے عرب امراء وسلاطین کے ساتھ ان کی بے باکی اور اسلامی حمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ مولانا ان عربوں کی لاپرواہیوں کو بیان کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ چھوٹے چھوٹے عربی رسائل میں بے خوف ہو کر ان سے خطاب کرتے۔ مولانا کے انتقال کے بعد استاذ محترم نے جو تعزیتی تقریر کی اس سے مترشح تھا کہ ان کا حسنی خانوادے سے گہرا تعلق تھا، (۲۲-۲۳ فروری ۲۰۰۰ء) علی گڑھ میں مولانا ندوی سمینار میں انہوں نے سید ابوالحسن علی ندوی (مولانا علی میاں) کی عربی تحریریں اور عالم عرب کے عنوان سے مقالہ پیش کیا(۲)۔ چونکہ مولانا علی میاں کو انہوں نے ایک ایسے استاذ کی حیثیت سے جانا جن کے یہاں وسعت ظرف، طالب علم کے ساتھ شفقت ومحبت اور اس کے مستقبل کے تئیں فکرمندی تھی، استاذ مربی بھی ہوتا ہے، تدریس اور تربیت دونوں میں اشتراک نہ ہو تو ایسی تدریس کو تدریس عقیم ہی کہا جائے گا۔ مولانا علی میاں کے مربی ہونے میں کیا شک؟ ان کے تربیت یافتہ شاگرد دنیا بھر میں تعلیمی و تحقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ استاذ محترم ایک مربی کے لحاظ سے ان کے اعلیٰ اقدار سے واقف تھے۔ نیز ان کے خطبات اور تصانیف کی سطر سطر ان کی یادداشت میں تھی اس لیے مولانا کا شخصی اور علمی تعارف کرانے میں وہ معلومات کا دریا بہا دیتے۔ مجلہ ''ثقافۃ الہند'' میں ان کا مقالہ ''العلامۃ السید ابو الحسن علی الحسنی الندوی وحبہ للوطن العزیز الھند وابنائہ'' لائق مطالعہ ہے۔ جس میں مولانا علی میاں کی شخصیت نکھرتی ہوئی اور مختلف رنگوں میں مہکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ان کے مقالہ بعنوان ''علامہ ابوالحسن علی حسنی ندوی کی عربی تحریریں اور دنیائے عرب'' (۳) میں مولانا کی فکری جہتوں پر قابل قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں ایک اقتباس اول الذکر مقالہ سے اس لیے دیا جارہا ہے کہ مولانا علی میاں کی شخصیت کے ساتھ استاذ محترم کی عربی تحریر کی خوبصورتی بھی سامنے آجائے:

> 'کان رحمہ اللہ رقیق الحس، یلاحق الاسفار بعد الاسفار ویجوب القری والارياف، ویقدم الی الناس ما اعطاہ الہ من الحب والمعرفۃ، ویخوفھم عن مصیرھم ومستقبلھم، وان ھذہ الاسفار المتلاحقۃ التی کان ھو یقطعھا حبا للناس وعملاً لسعادۃ الانسانیۃ وفلاحھا تزید قوۃ من قلبہ وشجاعۃ فی نفسہ وحلاوۃ فی لسانہ ورشاقۃ فی بیانہ، فھو یبدو فی جولانہ

كالبلبل الشادى الذى يسحر الناس بتغريده لا تفرق بينه وبين الناس لغة ولا وطن ولا جنسية ولا لون، يعيش بين الاشجار والاغصان حدا طليقا يملا العالم بالجمال والبهاء، فاللغات المختلفة الثقافات المتنوعة والحضارات المتعددة والمنيات المتفرقة فى العالم هى كلها من صنع الانسان الذى كرمه الله بالعقل والفكر ونوره بالحب والوداد "ولقد كرمنا بنى آدم وحملنٰهم فى البر والبحر ورزقنٰهم من الطيبات وفضلنٰهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا" فلا بد ان تقدر هذه النعم كلها...(۴)

ندوہ کے عباسی ہال میں ایک بار استاذ محترم کی تقریر تھی، جس کا موضوع ہندوستان میں عربی زبان وادب تھا۔ ہندوستان کے چیدہ اہل علم موجود تھے۔ یہ بات غالباً ۱۹۸۲ء کی ہے جس میں راقم اپنے استاذ گرامی مرحوم پروفیسر عبیداللہ فراہی کے ساتھ ہال میں موجود تھا۔ استاذ گرامی نے اپنی تقریر سے ایک سماں باندھ دیا۔ مولانا فراہی کا اس تقریر میں خصوصی ذکر تھا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا فراہی علماء اسلام میں ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ وہ ناقل نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں ابداع وابتکار ہے۔ مولانا نے علوم قرآن اور ادب عربی کا مطالعہ دقت نظر سے کیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی انہیں ابن تیمیہ کی صف میں کھڑا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ترجمان القرآن تھے۔ استاذ محترم مولانا فراہی کی ''جمہرۃ البلاغہ'' کا خصوصی ذکر کرتے، ان کے نزدیک پورے عربی لٹریچر میں اس ادبی کاوش کی مثال مفقود ہے۔ بالخصوص ارسطو کے بلاغی نظریات کا عالمانہ محاکمہ بے مثال ہے۔ مولانا نے وضاحت کی کہ کذب بیانی کا کلام بلیغ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جبکہ ارسطو کی اتباع میں عرب اور دیگر زبانوں کے ادباء گمراہ ہوئے ہیں۔ اس تناظر میں مولانا نے عرب ناقدین کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ کلام بلیغ کی بنیاد صداقت و دیانت پر ہے۔ استاذ محترم نے مقالہ ''مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات جمہرۃ البلاغہ کی روشنی میں'' اس یگانۂ روزگار کا خصوصی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ایک عبارت ملاحظہ ہو:

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اس صدی کی پہلی دہائی میں مرتب کی گئی۔ اس وقت ہندوستان میں نقد و بلاغت کی تعلیم وتدریس کا طریقہ بالکل بے جان و بے مقصد ہو چکا تھا۔ مختصر المعانی اور تلخیص المفتاح کے منتخب ابواب جو نصاب تعلیم میں تھے انہیں پر اکتفا کیا جاتا تھا، جہاں تک اس موضوع پر تصنیف وتالیف کا تعلق ہے اس پر کچھ کتابیں ضرور لکھی گئیں لیکن ان کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں عربوں کے زمانۂ زوال کے علماء نقد و بلاغت کی کتابوں کی تقلید یا ان پر حواشی کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت کی

بات یہ ہے کہ خود بلاد عربیہ میں فن بلاغت و نقد کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف علماء ہند کی تصانیف سے کسی بھی حالت میں بہتر نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا مرکز جامعہ ازہر تھا، لیکن وہاں بھی علمی اور ادبی ذوق کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

میری حقیر رائے میں یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے جو مولانا حمید الدین فراہی کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے علماء کے لیے باعث افتخار ہے۔ (۵)

مولانا علی میاں کی توجہ اور شفقت سے وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے شام و مصر روانہ ہوئے جس کی وجہ سے ان کا عربی اور علمی افق مزید وسیع ہوا اور مصر کے علماء، ادباء اور شعراء سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ طٰہ حسین، احمد امین، عقاد، حسین ہیکل، عمر الدسوقی، مصطفٰی صادق الرافعی، ڈاکٹر محمد مندور، احمد شاکر اور محمود محمد شاکر کے خطبات میں وہ شریک ہوئے۔ عقاد کے متعلق ان کا خیال ہے کہ انہوں نے جدید فلسفہ کا مطالعہ غور و خوض سے کیا تھا۔ جدید ادباء اور ناقدین میں ان جیسا کوئی ادیب ناقد اور فلسفی ملنا مشکل ہے۔ ادبیات کے ساتھ اسلامیات پر عقاد کی زبردست گرفت تھی، اسلامی فلاسفہ کے رموز عقاد کی نظروں میں تھے، عقاد نے اسلام کی علمی نمایندگی کی۔ مستشرقین کے علمی انحرافات کا انکشاف بھی کیا اور ان کے اعتراضوں کا مدلل جواب دیا۔ عقاد کی تصانیف سے ظاہر ہے کہ انہوں نے عربی اور انگریزی ادب کا یکساں مطالعہ کیا تھا۔ ''مدرسۃ الدیوان'' ان کی ادبی کارگزاریوں کا آئینہ ہے۔ جس نے جدید عربی ادب کو ایک نیا رخ دینے میں اہم کردار ادا کیا، ''العبقریات'' عقاد کا شاہکار ہے۔ انہوں نے اسلام کے عمائد کی ایک مستند تصویر پیش کی ہے بالخصوص سیرت پاک کے مطالعہ میں انہوں نے ایک الگ راہ اختیار کی ہے۔ عبقریۃ محمدؐ گزشتہ تصانیف کی اتباع ہرگز نہیں ہے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عائشہؓ پر کتابیں انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ ایک اور مصری نامور محمود محمد شاکر کی شخصیت بھی ان کے نزدیک غیر معمولی رتبے پر فائز تھی۔

ان حضرات کے علاوہ انہوں نے جن شخصیات کا اثر قبول کیا ان میں پروفیسر عبدالعزیز میمنی بھی ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ دنیائے عربی ان کے علم و فضل پر ایمان لا چکی ہے۔ پروفیسر میمنی سے ان کی مصر میں ملاقات ہوئی تو وہ ان کے ساتھ ساتھ رہے انہوں نے خود فرمایا کہ چلو تمہارا یہاں کے اہل علم سے تعارف کرا دیتے ہیں۔ عرب ادباء اور مفکرین اور ناقدین میمنی صاحب کے علمی وقار اور ادبی جلالت کے دل سے معترف تھے۔ جس کا اظہار مجلہ المجمع العلمی الہندی کے میمنی نمبر سے ہوتا ہے۔ پروفیسر سعید الافغانی، شیخ احمد الجاسر، ڈاکٹر ناصر الدین الاسد، ڈاکٹر عدنان الخطیب، ڈاکٹر شاکر فحام، ڈاکٹر ابراہیم السامرائی (۶)۔ جیسے مقتدر و مستند ارباب نقد و نظر نے میمن صاحب کی مہارت علمی کا اعتراف کیا ہے (۷)۔ استاذ فرماتے کہ

پروفیسر میمنی کے استحضار میں عربی اشعار کا ایک دفتر موجود تھا۔ لسان العرب کی بے شمار غلطیاں ان کی نظر میں تھیں۔ ان کی مختلف تصانیف کا ذکر کرکے بالخصوص ''ابوالعلاء المعری ومالہ وما الیہ'' کے متعلق بتاتے کہ اس کتاب کی وجہ سے عربوں نے ان کو عربی ادب کا سنگ میل قرار دیا۔ فرماتے کہ ابوالعلاء معری کو صرف دو اہل علم جانتے ہیں میمنی اور طٰہ حسین۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میمنی کے علمی و ادبی آثار و اقدار کو دیکھتے ہوئے پروفیسر مختار الدین احمد نے مجلہ ''المجمع العلمی الہندی'' کا میمنی نمبر نکالا جس میں عرب و عجم کے علماء اور ادباء نے ان کی عربی دانی اور وسعت مطالعہ کا اعتراف کیا۔ اس میں استاد محترم کا مضمون ''العلامۃ عبدالعزیز المیمنی ومنہجہ فی البحث والتحقیق'' بھی ہے۔(۸)

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ المجمع کے اس نمبر میں جگہ جگہ استاذ محترم کی قلم فرمائیاں ہیں، مدیر کی حیثیت سے نام پروفیسر مختار الدین احمد کا ہے لیکن اس کی ادارت اور ترتیب و تنظیم میں ان کی بے پناہ کوششیں شامل رہی ہیں، انہوں نے متعدد اردو نگارشات کو عربی میں منتقل کیا۔ پروفیسر مختار الدین نے مجلے کی تمام ذمہ داریاں ان ہی کے سپرد کررکھی تھیں۔ عربوں کے خطوط کے جوابات بھی ان سے لکھواتے تھے۔ استاذ محترم کی پروفیسر عبدالعلیم صاحب سے غیر معمولی عقیدت تھی، کہتے تھے کہ ان کی جیسی انگریزی جاننے والے اور لکھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ ان کی عربی زبان و ادب پر قدرت کا بھی ذکر کرتے۔ عبدالعلیم صاحب پر وہ مختلف مواقع پر اظہار خیال کرتے رہے۔ ایک تقریر آرٹس فیکلٹی کے لاؤنج میں کی تھی جس میں اس پہلو کو خاص طور سے اٹھایا کہ شعبہ عربی اور مسلم یونیورسٹی دونوں کے استحکام میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ ''عقیدۃ اعجاز القرآن کی تاریخ'' ایک اعلیٰ درجے کا کام ہے۔

استاذ اپنے مطالعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ شعبہ عربی اور اسلامیات کے کتب خانے میں جدید عربی ادب کا ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور یہ تمام چیزیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ لسان العرب کو اس قدر دیکھا ہے کہ اگر کوئی لفظ دیکھنا ہوتا تو ایک یا دو بار کی کوشش کافی ہوتی۔ لفظوں کے حقائق اور لسانی تاریخ سے بخوبی متعارف تھے۔ اکثر فرماتے کہ الفاظ مراحل در مراحل اپنے کوائف بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے اسفار انہیں نئے آہنگ اور نئے سر عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنی جڑوں سے پیوستہ رہتے ہوئے اپنے رنگ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ وہ تلاوت قرآن کے پابند تھے۔ دوران تلاوت فرہنگ قرآن پر ان کا ارتکاز ہوتا، جس سے لغت پر ان کی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا۔ وہ کہتے کہ قرآنی الفاظ کے استعمال میں

ایک اعجاز ہے اگر انسان کی گرفت میں یہ قرآنی اور لسانی اعجاز نہ آسکے تو مفردات قرآن سے محظوظ ہونا اور اس کی عظمت کا احساس ہونا مشکل ہے۔ وہ اکثر مندرجہ آیت کریمہ پڑھتے اور اس کے لسانی سحر میں کھو جاتے۔ فرماتے کہ دنیا کا کوئی ادب اس کے مقابلتاً کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ آیات میں الفاظ نگینے کی طرح اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے متبادل کی تلاش سعی لاحاصل ہے اور یہ استعمال الہامی اور ربانی کے سوا کچھ اور نہیں:

وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ وکانوا فیہ من الزاھدین وقال الذی اشتراہ من مصر لامراتہ اکرمی مثواہ عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا۔(یوسف:۱۲/۲۰-۲۱)

اور بیچ آئے اس کو بھائی نقص قیمت کو گنتی کی، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو، آبرو سے رکھ اس کو شاید ہمارے کام آئے یا ہم کرلیں اس کو بیٹا۔

فرماتے کہ ''بثمن بخس'' میں ایک خاص قسم کا ادبی حسن ہے، کہا جاتا ہے کہ ایسے الفاظ لائے جائیں کہ مفہوم کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ اردو میں ہم کہتے ہیں کہ یہ چیز ہم نے کوڑیوں کے دام خرید لی۔ اس میں آگے ''زاہدین'' آیا ہوا ہے، جس کی وجہ سے مفہوم بالکل نکھر گیا ہے۔ زاہد بالعموم اس شخص کو کہتے ہیں جس کے یہاں دنیا بیزاری ہو، اور زاہد خشک اسے کہتے ہیں جو دنیا کو لبادہ نہ بنائے۔ قرآن کریم نے یہ صراحت کی کہ اہل قافلہ کو اس لڑکے میں قطعاً دلچسپی نہ تھی، بلکہ اسے فروخت کرکے اپنی جیب گرم کرنے کی فکر تھی۔ چنانچہ عزیز مصر نے اسے خریدا اور اپنی بیوی سے کہا کہ ''اکرمی مثواہ'' جس کا اردو ترجمہ ناممکن ہے۔ بلکہ اس کے اعجاز اور اس کی بلاغت کو کسی اور زبان میں منتقل کرنا ہی ناممکن ہے۔ صرف اس کی توضیح و تشریح ہے۔ جس کی تفسیر یہ ہے کہ بڑے ناز نخرے، پیار، محبت اور انتہائی نگہداشت سے اس کی پرورش کی جائے۔ ''اکرمی'' کہہ کر پرورش کے تمام ممکنہ مطالب اس میں سمو دیے گئے۔ ''کریم'' اللہ کی صفت ہے وہ اپنے بندوں کی دیکھ ریکھ میں ہر طرح کے لطف و کرم کا ثبوت دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے اس کی خود توضیح کی ہے کہ ''ان اللہ لیس بظلام للعبید'' یعنی وہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کو پسند نہیں کرتا۔ عزیز مصر یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس بچے کی تربیت اور آرام و آسائش میں کسی طرح کا تساہل برتا جائے۔ فرماتے کہ اس انداز سے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو انسان اس کے لسانی سحر سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ بھی فرماتے کہ سید قطب شہید نے ''التصویر الفنی'' میں اسی انداز سے قرآن کریم کو پڑھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ استاذ محترم اس آیت کریمہ کی توضیح و تشریح بھی ایک خاص انداز سے کرتے:

فابعثوا احدکم بورقکم ھذہ الی المدینۃ فلینظر ایھا ازکی طعاما فلیاتکم برزق

منہ ولیتلطف ولا یشعرن بکم احدا (الکہف:۹۱/۸)

فرماتے کہ مفسرین نے "ورق" سے سکہ اور چاندی مراد لیا ہے جب کہ اس سے کاغذی کرنسی مراد ہے۔اس کے بعد "ازکی طعاما" آیا ہوا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ کھانا بالکل تازہ ہو، بعض کھانے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کھا کر انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔اہل کہف اپنے ساتھی سے کہتے ہیں کہ کھانے سے تازے پن کی خوشبو اٹھتی ہو، نفیس ہو، اس سے یہ مراد نہیں کہ کھانا بہت مہنگا ہو، بلکہ صرف یہ یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ دیکھو یہ خیال رہے کہ کھانا باسی نہ ہو۔آگے "فلیتلطف" آیا ہوا ہے کہ اس ویرانے شہر میں تم کھانا لینے اس طرح چپکے سے جاؤ کہ تمہاری زبان، تمہارے رنگ ڈھنگ اور کسی انداز سے تمہارے پردیسی ہونے کا اندازہ نہ ہونے پائے کہ ایک مصیبت ہم پر آن پڑے۔"فلیتلطف" میں یہ تمام نزاکتیں موجود ہیں۔اللہ کی صفت بھی "لطیف" ہے یعنی وہ باریک بیں ہے، دنیا کی ہر چیز اس کی نظر میں ہے۔استاذ محترم ایک باریک بیں ادیب اور رمز شناس صاحب قلم تھے۔وہ الفاظ کی تہہ داریوں سے واقف تھے۔

وہ اکثر قرآن کریم کے لسانی محاسن پر اظہار خیال کرتے۔ایسی بہت سی باتیں راقم کے ذہن میں موجود ہیں لیکن طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال حاضر ہے:

فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین۔

(آل عمران:۶/۳)

انہیں بھی اللہ کی راہ میں تکلیفیں پہنچیں لیکن نہ تو انہوں نے ہمت ہاری نہ سست رہے اور نہ دبے اور اللہ صبر کرنے والوں ہی کو چاہتا ہے۔

فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں تین الفاظ ایسے ہیں جن کے باہمی فرق کو جاننا انتہائی ضروری ہے۔ بالعموم مفسرین وھنوا، ضعفوا اور استکانوا میں کوئی فرق ملحوظ نہیں کرتے اور تینوں کو مترادف سمجھتے ہیں حالانکہ عربی میں ترادف نہیں ہوتا، جیسا کہ بنت الشاطی نے اپنی معروف کتاب "قرآن کا لسانی اعجاز" (۱۲) میں اس پہلو پر معرکہ آرا گفتگو کی ہے۔استاذ گرامی تینوں الفاظ کی تشریح اس طرح کرتے کہ تینوں کے باہمی فرق کھل کر سامنے آجاتے۔عربی میں "وہن العظم" آتا ہے جس کا مفہوم ہے کہ اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہوگئی ہیں اس کا کمر بستہ اور دشمنوں کے بالمقابل کھڑا ہونا دشوار ہے۔گویا قرآن کریم نے صراحت کی ہے کہ دشمنان اسلام کے بالمقابل سینہ سپر رہنے کی ضرورت ہے۔اس کی توضیح یہ ہے کہ میدان جنگ میں "وما ضعفوا" یعنی سستی اور کاہلی دکھانے کی ضرورت نہیں بلکہ وہاں اولوالعزمی اور ثبات قدمی کی ضرورت

ہے۔ مجاہدین اسلام کسی پہلو سے خود کو کمزور ہونے کا ثبوت نہ دیں۔اسی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ''وما استکانوا'' کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی حالت میں مخالفین اسلام کے سامنے خود کو سپر انداز نہ کریں۔ گویا مجاہدین فی سبیل اللہ کے تین اوصاف بتائے گئے ایک تو کمربستہ ہونا، دوسرے چاق و چوبند رہنااور تیسرے ہتھیار نہ ڈالنا۔

استاذ محترم کی پوری زندگی تدریس و تحقیق میں گزری۔ قلم وقرطاس کو وتیرۂ حیات قرار دیا۔انہوں نے قرآن کریم اور ادب عالیہ کا مطالعہ کیا تھا جس نے انہیں حساس بنادیا تھا۔ حکمت و بصیرت کی دولت سے ان کا ایاغِ فکر مملو تھا۔ علامہ عبدالعزیز میمنی پر مضمون میں شام کی جلوہ آرائیوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ شعبۂ عربی میں استاذ کے آنے سے قبل شعبہ کی تمام تر توجہ صرف مخطوطات کو ایڈٹ کرنے پر رہی۔ ایڈٹ کا تعلق پسینہ بہانے سے ہے۔ یہ معلومات مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ تحقیق و تخریج اور ترتیب و تحشیہ سے صرف معلومات ملتی ہے، اس کا تخلیق، ابداع اور ابتکار سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جس طرح پودے اور پھول حسن کائنات میں رنگ بھرتے اور ایک نئے جہان کی تعمیر کرتے ہیں یہی سب کچھ تخلیق کرتی ہے۔ استاذ محترم نے اس تخلیقی مزاج کو ایک نیا رخ دیا۔ نئے موضوعات اور جدید عربی کے رجحانات پر تحقیقی مقالات لکھے جانے گے۔اساتذہ اور طلبہ کے اندر عربی لکھنے اور بولنے کا شوق پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے تلامذہ بحث و تحقیق میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ شعبہ کی علمی ترقی میں ان کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ نو بجے شعبہ آجاتے، ابتدا میں سائیکل ان کی ہم سفر رہتی۔ حالات سازگار ہوئے تو رکشے پر نظر آنے لگے اور جب معاشی مسائل مزید بہتر ہوئے تو کار انہیں دوڑانے لگی۔ استاذ محترم تحدیث نعمت پر سختی سے عمل کرتے۔ خوش لباسی ان کے مزاج کا حصہ تھی، نئی شروانیاں، نئے سوٹ اور ٹائیاں ان کے حسن میں اضافہ کرتیں۔ اکثر نئی شرٹ زیب تن کرتے تو ہم لوگوں سے داد کے خواستگار ہوتے۔ خوش لباسی عموماً شعبہ جات اور تقاریب تک محدود رہتی ہے لیکن استاذ محترم گھر میں بھی سپید براق بنے رہتے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ استاذ محترم کا شعری ذوق بھی خاصہ کی چیز تھا۔ عربی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شام کی چائے پر غزل سرا ہوتے، خاکسار سے داد تحسین کے لیے بے چین ہوتے۔ کاش یہ شعری سرمایہ محفوظ ہو جاتا۔ جب کوئی مضمون چھپتا تو اپنے تلامذہ سے پڑھواتے اور فرماتے کہ میں نے زبان کو اوج ثریا عطا کیا۔ فرماتے کہ علامہ شبلی کی زبان نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔ علامہ کی ظہور قدسی تو کلمات الہامی کے سوا کچھ نہیں یہی وجہ ہے کہ مولانا دریابادی کو کہنا پڑا کہ علامہ مصنف اور

مصنف گردونوں ہیں۔ تاریخ نے ایسے معلم اول کا نظارہ کم کیا۔ ''افادات مہدی'' بھی علامہ کی ایجادات و تحقیقات کا اعلان کرتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے زبان و بیان نے مجھے لکھنا سکھایا۔ فکر ندوی نے مجھے بال و پر عطا کیے اور ان کے ستائشی کلمات نے مجھے عزم صمیم عطا کیا۔ یہ بھی فرمایا کہ مولانا محمد رابع ندوی نے ہمیشہ میری تحریروں کو قدر کی نظر سے دیکھا۔ میرے عزیز دوست مولانا واضح رشید ندوی نے میری ہر تخلیق اور ہر تحریر کی پذیرائی کی ہے۔ شاید میرا یہ خیال غلط نہ ہو کہ مولانا علی میاں کے بعد اگر کوئی خوبصورت زبان لکھنے والا تھا تو میرے یہی عزیز دوست۔ ان کی وفات سے عربی انشا کا ایک ستون گر گیا۔ سبک دوشی کے بعد پیہم مرحوم صدیق حمیم کا اصرار رہا کہ تم ندوہ آجاؤ تمہارے علم و فضل سے اساتذہ کرام اور طلبہ دونوں مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔ یقیناً ہمیشہ انہوں نے خود کو حسنی خاندان کا ایک فرد تصور کیا اور باور کرایا کہ اسی خاندان سے ان کو علم و فضل نصیب ہوا۔ ادباء عرب کی زیارت نصیب ہوئی اور شہرت و عزت کی دولت بھی ہاتھ آئی۔

استاذ محترم کی خواہش رہی کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کریں۔ یہ خواہش خوب رنگ لائی۔ دونوں بیٹے انجینئر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ بیٹوں کی ترقی سے استاذ محترم اندر سے جوش مسرت میں بیٹوں کے قصائد پڑھتے۔ بار بار فرماتے کہ امت مسلمہ کی ترقی کا اصل راز تعلیم و تعلم ہے، تعلیمی افلاس زوال کی علامت ہے۔ علامہ شبلی کے فلسفہ تعلیم پر ان کا گراں قدر مقالہ ہے (۱۳)۔ استاذ محترم جس طرح اپنے خاندان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی طرح قوم کے بچوں کو بھی دیکھنے کے تمنائی تھے۔ ایم اے کے بعد طلبہ کو پی ایچ ڈی سے منسلک دیکھنے کے طالب ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً دو درجن طلبہ نے ان کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی ڈگریاں حاصل کیں۔

جامعات میں ان کو اعزازات ملے۔ اہل علم ان کے علمی مقام و مرتبہ سے واقف تھے۔ ادارہ سرسید کے اساتذہ کرام، عملہ اور طلبہ ان کو معزز گردانتے، اسٹاف ایسوسی ایشن اور رجسٹرار آفس کا کبھی منھ تک نہ دیکھا، نو بجے شعبہ میں آکر بیٹھ جاتے اور ڈھائی بجے تک علمی و انتظامی مشغولیات سے انہیں فرصت نہ ملتی۔ افتخار و استکبار کا یہاں گزر ہی نہیں۔ تقریباً ۳۵ سال استاذ محترم کے ساتھ گزارنے کے مواقع میسر آئے۔ جو میری زندگی کی متاع گراں ہے۔ بعد مغرب حاضر ہوتا تو استاذ محترم کا چہرہ مانند باغ عدن، کھل اٹھتا۔

مرحوم پروفیسر رفیع الدین صاحب نے سلیکشن بورڈ کے سامنے شیخ الجامعہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے جلیل القدر استاذ کہاں ملتے ہیں؟ پروفیسری ان کے سامنے کیا معنی رکھتی ہے؟ وہ تو پروفیسروں کے

پروفیسر ہیں، پروفیسر شپ سے ان کی عزت نہیں بلکہ ان کی وجہ سے ادارے کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ استاذ محترم کو فردوس بریں نصیب ہو اور ان کے نقش قدم کی اتباع کرتے ہوئے عربی زبان وادب کی خدمت کا جذبہ میسر ہو۔ استاذ محترم تاحیات عربی پروری میں سرگرم رہے۔ مجلہ ''البعث الاسلامی'' کی تاسیس میں ان کا قابل ذکر کردار رہا، صرف اس لیے نہیں کہ عربی زبان وادب ہی سے دینی اور اسلامی شناخت ہے بلکہ یہ زبان علوم وفنون کا خزانہ ہے اور دنیا کو ایک نیا آہنگ دینے کا وسیلہ بھی۔ اکثر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی یہ نصیحت دہراتے کہ راشد عربی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بناؤ، یہی چیز تم کو اوروں سے منفرد بنا سکتی ہے۔ استاذ محترم نے یہ بھی بتایا کہ مولانا مجھ سے فرماتے کہ ''کلیلہ ودمنہ'' کو حرفاً حرفاً بار بار پڑھو۔ یہ کتاب زبان پر قدرت عطا کرتی ہے۔ اور تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ کرو کیونکہ مفسرین کے آراء اور تاویلات آیات سامنے آجاتی ہیں۔ استاذ محترم اپنی مجالس میں اکثر مولانا ندوی کا ذکر جمیل چھیڑتے، ان کے ساتھ عرب امراء وادباء کا کیا برتاؤ رہا اس پر روشنی ڈالتے۔ بلاد عربیہ میں مولانا کو دیے گئے اعزازات کی داستانیں بیان کرتے۔ مولانا کے انتقال پر بے شمار عرب علماء اور ادباء نے حضرت مولانا کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ استاذ گرامی نے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے محاسن پر بھی متعدد بار اظہار خیال کیا۔ مختارات کے انتخاب پر مولانا کی زبان وادب پر وسیع النظری کا اعتراف کرتے۔ استاذ محترم کے جانے سے ایک بڑا علمی خسارہ ہوا ہے بالخصوص راقم کا منبع شفقت اور چشمۂ علم و حکمت ہی خشک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ میرے استاذ محسن کو اپنی رحمتوں کی آغوش عطا فرمائے۔

حواشی

(۱) پروفیسر محمد راشد ندوی کی حیات وخدمات کے لیے دیکھیے: نیر تاباں، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، اردو اپرنٹرز، شاہدرہ، دہلی، طبع اول، اگست ۲۰۱۱ء، ص: ۲۵۵-۲۷۲۔

(۲) وضاحت کے لیے دیکھیے: گلہائے رنگ رنگ، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جنوری ۲۰۰۱ء، ص: ۲۲۹-۲۳۶۔

(۳) وضاحت کے لیے دیکھیے: جدید وقدیم زبان وادب: اشخاص وافکار، پروفیسر محمد راشد ندوی (مرتب: ڈاکٹر ابوذر متین)، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء، ص ۳۲۹-۳۳۷۔

(۴) العلامة السید ابوالحسن علی الحسنی الندوی وحبه للوطن العزیز الهند وابناءه، الاستاذ الدکتور

محمد راشد الندوی، ثقافة الهند، ص: ۱۲۲-۱۲۳۔

(۵) مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات، جمہرۃ البلاغہ کی روشنی میں، پروفیسر محمد راشد ندوی (علامہ حمید الدین فراہی: حیات وافکار، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص: ۵۴۶)

(۶) نامورانِ عربی زبان وادب کی نگارشات عبدالعزیز المیمنی کی پہلی جلد (۱۰،۱-۲، شوال ۱۴۰۵ھ / یونیو ۱۹۸۵ء) میں موجود ہیں۔

(۷) عبدالعزیز المیمنی کے دوسرے شمارے (۱۱/۲-۱) میں ڈاکٹر شاکر فحام اور ڈاکٹر علی جواد الطاہر کے مضمون 'مذاکرات الاستاذ عبدالعزیز المیمنی (ص: ۱۳۵-۲۰۴) اور 'العربیۃ علی قلم ہندی (ص: ۳۱۱-۳۱۳) شامل ہیں۔ یہ دونوں صاحب علم وادب عرب دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

(۸) وضاحت کے لیے دیکھیے: مجلة المجمع العلمي الهندي، المجمع العلمي الهندي، جامعة على كره الاسلاميه بالهند، شوال ۱۴۰۵ھ / یونیو ۱۹۸۵ء، ۱۰/۲-۱، ص: ۱۶۹-۱۹۴۔

(۹) العلامة عبدالعزيز الميمني ومنهجه في البحث والتحقيق، ص: ۱۶۹۔

(۱۰) وضاحت کے لیے دیکھیے: ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق کے بارے میں پروفیسر عبدالعلیم کے خیالات و نظریات، ریاض الرحمن شروانی (مقالات ریاض شروانی، مرتبہ: ڈاکٹر ابوذر متین، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، طبع اول، ۲۰۱۶ء، ص: ۹۹-۱۰۸۔

(۱۱) پروفیسر عبدالعلیم: اوصاف و کمالات، ریاض الرحمن شروانی (انسان کیسے کیسے، مرتبہ: ڈاکٹر فخر عالم ندوی) ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، طبع اول، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۰۸-۲۰۹۔

(۱۲) وضاحت کے لیے دیکھیے: قرآن کریم کا اعجاز بیان، ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی، (مترجم: محمد رضی الاسلام ندوی)، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، بار اول، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص: ۲۶۸-۳۰۱۔

(۱۳) وضاحت کے لیے دیکھیے: علامہ شبلی کے تعلیمی افکار: بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے پس منظر میں (جدید و قدیم عربی زبان وادب، اشخاص وافکار، ص: ۲۴۸-۲۷۰)۔

(۱۴) وضاحت کے لیے دیکھیے: ممالک اسلامیہ کی تصویر سفر نامہ روم و مصر و شام کی روشنی میں (جدید و قدیم عربی زبان وادب، اشخاص وافکار، ص: ۲۲۳-۲۴۷)

بیان شبلی: چند نوادر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

Mob: 919838573645

نوادرات شبلی کی دریافتوں کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں متعدد نوادر ہاتھ آئے۔ جن کا ایک مجموعہ ''نوادرات شبلی'' کے نام سے راقم نے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ بعدازاں چند اور تحریریں ''علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں'' کے عنوان سے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئیں، جو اب راقم کے نئے مجموعہ مقالات ''نقوش شبلی'' میں شامل ہے۔ اس کے بعد جو نوادر شبلی ہاتھ آئے، ان کی ایک قسط ''جہان شبلی'' کے عنوان سے ماہنامہ اردو دنیا دہلی اکتوبر ۲۰۱۸ء میں اور دوسری قسط ''بیان شبلی'' کے نام سے معارف جنوری ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی۔ اس سلسلہ کی تیسری قسط پیش ہے۔

(۱)

تقریظ حسام الاسلام: ''علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں'' مطبوعہ ماہنامہ معارف اپریل ۲۰۱۹ء میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ

> ہمارے کرم فرما ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری کی اطلاع کے مطابق مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی نے ''صمصام الاسلام'' کے نام سے ''فتوح الشام'' واقدی کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا، جو ۱۹۱۴ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریظ علامہ شبلی کے قلم سے ہے، لیکن یہ منظوم ترجمہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی نام سے فتوح الشام کا منظوم اردو ترجمہ سید عبدالرزاق کلامی نے بھی کیا ہے جو مطبع نول کشور لکھنو سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ اس میں کئی تقریظات شامل ہیں، لیکن علامہ شبلی کی تقریظ شامل نہیں ہے۔ ......یقین ہے ''صمصام الاسلام'' کی تقریظ شبلی ایک نہ ایک دن ضرور دستیاب ہو گی۔ اس لیے کہ اس کی اطلاع ایک محقق ڈاکٹر سید حسن عباس نے ایک بڑے محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۰۴-۱۹۸۱ء) کے حوالہ سے فراہم کی ہے۔(۱)

اب تقریباً دو برس بعد تراجم کے سلسلہ میں ڈاکٹر عزیزاللہ شیرانی کی کتاب ''راجستھان میں اردو تراجم'' پر نظر پڑی تو اس میں امام واقدیؒ کے رسالہ ''فتوحات اسلام'' کے اردو ترجمہ ''حسام الاسلام'' کا ذکر ملا۔ اس کے تعارف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ''اس ترجمہ کی تقریظ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے لکھی ہے''۔

(ص ۱۷) چنانچہ راقم نے ''حسام الاسلام'' کی تلاش شروع کی اور اول وہلہ میں وہ ریختہ ڈاٹ کام پر مل گئی۔ اور اسی کے ساتھ علامہ شبلی کی وہ نادر و نایاب تقریظ بھی ہاتھ آگئی، جس کی عرصہ سے تلاش تھی، اور جس کا ذکر ''ذخیرہ شبلیات'' میں راقم کی نظر سے اب تک کہیں اور نہیں گذرا ہے۔

حسام الاسلام دراصل صمصام الاسلام اور قمقام الاسلام کے منظوم مترجم مولانا حافظ سید محمد عبدالرزاق حسنی کلامی [م:۱۸، فروری ۱۹۱۶ء] بن مولانا سید محمد سعید حسنیؒ کا نتیجہ فکر ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۳۲ھ میں صوفی محمد قادر علی خاں کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔ یہ نادر تقریظ قارئین کے نذر کی جاتی ہے۔

تقریظ

''چکیدۂ کلک جواہر سلک مولانائے معظم مکرم فرید آواں وحید دوراں شمس العلماء مولانا محمد شبلی نعمانی دام برکاتہم

تقریظ حسام الاسلام فی فتوحات سید انام (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ شعراء نے ہر قسم کے مضامین نظم کیے اور سلاطین وغیرہ کے کارناموں پر مثنویاں لکھیں لیکن جو چیز سب پر مقدم تھی یعنی آنحضرتؐ کے غزوات، اس کو کسی نے بھی ہاتھ نہ لگایا۔ فارسی زبان میں صرف حملہ حیدری ایک کتاب ہے، جو اس موضوع پر لکھی گئی، لیکن اس کے مصنف نے بہت کچھ تحریف و تدلیس سے کام لیا ہے اور اسی وجہ سے مقبول عام نہ ہو سکی۔ اردو میں آج تک کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تاریخی واقعات کا بے کم و کاست نظم کرنا سخت مشکل ہے۔ شاہنامہ وغیرہ میں گو تاریخی واقعات ہیں، شاعر واقعیت کا چنداں پابند نہیں، جس واقعہ کو جس طرح چاہتا ہے گھٹا بڑھا کر لکھ دیتا ہے۔ بخلاف اس کے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں کسی قسم کی کمی بیشی ممکن نہیں۔ ع

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

ہمارے زمانہ میں جناب سید عبدالرزاق صاحب حسنی متخلص بکلامی نے اس دشوار گذار راہ میں قدم رکھا اور واقدی کے غزوات کو بعینہ نظم میں ادا کیا۔ باوجود نظم کی پابندیوں کے واقعیت سے کہیں تجاوز نہیں پایا جانا اور یہ سخت مشکل بات ہے۔

سید صاحب موصوف اس مشہور خاندان سادات سے ہیں جس کا احسان تمام ہندوستان پر ہے، یعنی جناب سید احمد صاحب جنہوں نے رنجیت سنگھ کے مقابلہ میں جہاد فرمایا تھا، اس لیے ایسے ثواب کا کام ان ہی

کے ہاتھ سے انجام پاسکتا تھا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے۔ آمین

شبلی

۲۸/ اگست ۱۹۱۱ء، مقام لکھنو امین آباد (۲)

(۲)

نظائرۃ المعارف القرآنیہ: ادارہ ''نظائرۃ المعارف القرآنیہ'' مشہور عالم دین اور مجاہد آزادی مولانا عبیداللہ سندھی [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء] نے دہلی میں قائم کیا تھا۔ ان سے علامہ شبلی کے گہرے مراسم تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا۔ علامہ شبلی ان کی روشن خیالی اور سیاسی بصیرت کے بھی معترف تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب [۱۸۹۷-۱۹۷۶ء] نے لکھا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے جب دہلی میں نظائرۃ المعارف قائم کیا تو تھانہ بھون آئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں علامہ شبلیؒ سے ملا تو ان سے مسلمانوں کی عام بے راہ روی، پریشانی اور مبتلائے آفات کا تذکرہ ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں قوم کی اصلاح کی تدبیر کیا ہے۔؟ علامہ شبلی نے کہا کہ

> قوم کی اصلاح صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں، جن کا قوم پر مکمل اثر ہو اور یہ اثر بغیر تقدس کے نہیں ہو سکتا اور تقدس بغیر تقویٰ اور کثرت عبادت و ذکر اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (۳)

ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات ۱۹۱۰ء میں اس وقت قائم ہوئے تھے، جب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے دونوں اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ

> یہیں (سرائے میر) مولانا مرحوم اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی میں پہلی ملاقات ہوئی اور تخلیہ میں گفتگوئیں ہوئیں اور ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ اس تعارف میں شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا حمید الدین صاحب مدت تک کراچی میں رہے تھے اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی سے اور ان سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں۔ دونوں میں قرآن پاک کے درس اور غور و فکر کا ذوق مشترک تھا۔ (۴)

مولانا عبیداللہ سندھی پر علامہ شبلی کو بڑا اعتماد تھا۔ سیرۃ النبی کے خلاف مچانے والوں نے جب واویلہ مچایا تو علامہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کا مسودہ انہیں کو دیا تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) کو دکھا کر اعتماد

حاصل کریں، مگر انہوں نے سرے سے مسودہ سیرت ہی نہیں دیکھا۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے جب دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کیا تو علامہ شبلی اسے دیکھنے کے لیے دہلی گئے اور اس پر اپنے تاثرات بھی لکھے۔ یہ تاثراتی تحریر روزنامہ پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہوئی اور حال میں دریافت ہوئی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

> نظارۃ المعارف القرآنیہ کے مقاصد قوم کے گوش گذار ہو چکے ہیں۔ اور میرے دل کی یہ بات ہے کہ میں ان مقاصد کو اہم المقاصد خیال کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ اس کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مولوی عبید اللہ صاحب ہی صرف وہ شخص واحد ہیں جو ان مقاصد کو انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی ذات خود ایک مدرسہ اور دار العلوم ہے۔ وہ جہاں بیٹھ جائیں اس کو نظارۃ المعارف کہہ سکتے ہیں۔ میں نے ۲۹؍ مارچ ۱۹۱۴ء کو اس کی درس گاہ دیکھا۔ ایک مختصر سا کمرہ فتح پوری کی مسجد کے حال میں ہے جو داخل مسجد ہے۔ چند طلباء اس وقت مصروف درس تھے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ چند گریجویٹ جن کے لیے زمین پر بیٹھ کر سبق پڑھنا نہایت نفس کشی کا کام ہے، بڑے شوق سے اس نفس کشی میں مشغول ہیں۔ اس سلسلہ سے بہت سی امیدیں ہیں۔ میرا جو خیال تھا کہ زمانہ حال کے موافق علماء پیدا کیے جائیں، انگریزی خوانوں کو عالم بنایا جائے وہ اسی طریقہ سے پورا ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ خدا مولوی صاحب موصوف کو جزائے خیر دے اور ندوہ کو چشم بصیرت کہ جو کام اس نے پیش نظر رکھا تھا وہ یہاں ہو رہا ہے۔

شبلی

یکم اپریل ۱۹۱۴ء۔(۵)

(۳)

جلسہ عطائے سند: روزانہ پیسہ اخبار کی ورق گردانی میں علامہ شبلی کی یہ مختصر تحریر نظر آگئی۔ جو غالباً ندوہ کے پہلے جلسہ عطائے سند سے متعلق ہے:

> ندوۃ العلماء کے جو اغراض و مقاصد ہیں ان کی نسبت کئی سال کے تجربے کے بعد ثابت ہوا کہ وہ اس وقت پورے ہو سکتے ہیں جب خود ندوۃ العلماء ایک دار العلوم اپنی تجویز کے مطابق قائم کرے اور اس میں مجوزہ اصول کے موافق تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ اگرچہ یہ کام بہت بڑے سرمائے کے بغیر انجام نہیں پا سکتا لیکن نمونہ کے لیے ایک چھوٹے پیمانہ پر مجوزہ دار العلوم کھولا گیا۔ مولویت کے درجہ کے لیے آٹھ برس کا زمانہ مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ پچھلے سال جو

دارالعلوم کے قیام کا آٹھواں سال تھا چار طالب علموں نے مولویت کے درجہ کی تحصیل ختم کی۔ ارادہ تھا کہ یہ جلسہ جب فضیلت کے درجہ کی تکمیل کرلیں تب دستار بندی کا جلسہ کیا جائے، لیکن چونکہ ہر طرف سے یہ صدا آرہی ہے کہ ندوہ نے اتنی مدت میں کوئی عملی کام نہیں کیا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ عطائے سند کا جلسہ اس سال کرلیا جائے۔ چنانچہ ۸؍شوال ۱۳۲۴ھ مطابق نومبر ۱۹۰۶ء روز یکشنبہ کو یہ جلسہ بمقام دارالعلوم ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج مقام لکھنو قرار پایا ہے۔ بہی خواہان اسلام سے درخواست ہے کہ اس جلسہ میں تشریف لائیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ دارالعلوم کی تعلیم وتربیت میں کیا خصوصیت ہے۔ اور یہ کہ منزل مقصود کا کس قدر راستہ ہم نے طے کرلیا ہے۔ اور کس قدر طے کرنا باقی ہے۔(۶)

(۴)

ایک نادر خط۔ ملا واحدی کے نام: علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔ ۱۹۱۴ء) کے مکتوبات دریافت ہونے کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ حال میں ملا واحدی دہلوی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] کے نام ایک اور خط ہاتھ آیا ہے۔ جو یہ ہے۔

اخیر دور میں علامہ شبلی اور خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۸-۱۹۵۵ء] دونوں بزرگوں میں بڑے دوستانہ بلکہ بے تکلفانہ مراسم قائم ہوگئے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں علامہ شبلی ان کے مہمان ہوئے۔ اور ایک ماہ حلقہ مشائخ دہلی میں ان کا قیام رہا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے خواجہ صاحب کی فرمائش پر تصوف کے موضوع پر تقریر کی۔ ضیاء الدین احمد برنی [۱۸۹۰-۱۹۶۹ء] اس تقریب میں شریک تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''عظمت رفتہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے جو حلقہ مشائخ قائم کیا تھا، اس میں درویشانہ لٹریچر کا اضافہ کرنا چاہا تو ملک کے متعدد نامور اہل قلم اور ادیبوں کے نام خطوط لکھے گئے۔ ان میں سرفہرست علامہ شبلی تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس سے بڑی دلچسپی لی اور نہ صرف تائید کی بلکہ اپنا ایک رسالہ ''بیان خسرو'' جو دراصل ''شعر العجم'' کا ایک باب تھا، درویشانہ لٹریچر میں اضافہ کی غرض سے بھیجا۔ جسے دفتر نظام المشائخ دہلی نے اسی حیثیت سے شائع بھی کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ رسالہ ''بیان خسرو'' درویشانہ ادب کے حصہ کے طور پر شائع ہوا ہے۔

۱۹۱۰ء میں حلقہ نظام المشائخ دہلی کو مزید ترقی دینے اور اس کا دائرہ وسیع اور مفید بنانے کے لیے اہل علم اور ارباب کمال کو خطوط لکھے گئے اور ان سے رائیں طلب کی گئیں۔ ماہنامہ نظام المشائخ کے ایک شمارے میں ان کے جوابات نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں پہلا نام مولانا حبیب الرحمن شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء]، دوسرا

نام مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] اور تیسرا نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی ارقام فرماتے ہیں:

حلقہ کی ضرورتیں میں نے سنیں ان سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اسلام کی روحانیت کا مظہر صرف تصوف ہے، لیکن موجودہ تصوف سے زیادہ کوئی چیز قابل اصلاح نہیں۔ اس لیے اس کے مراسم وعادات کی اصلاح کا قصد کرنا بہترین خدمات اسلامی ہیں۔

میں نے حلقہ کے متعدد رجسٹر دیکھے۔ نہایت خوش ترتیبی سے تیار کیے گئے ہیں۔ خدا خواجہ حسن نظامی صاحب قدس سرہ کی کوششوں کو کامیاب کرے۔

شبلی

۳۰، مارچ ۱۹۱۰ء۔ (۷)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''مکتوبات شبلی'' میں خواجہ حسن نظامیؒ کے نام علامہ شبلی کے وہ بیس خطوط جو انہوں نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' میں انتخاب کر کے شائع کیے تھے، وہ بھی شامل ہیں۔ ان تمام خطوط اور علامہ شبلی کے خط کی روشنی میں دونوں بزرگوں کے دیرینہ تعلقات اور دونوں کے تصوف کا ایک نیا مطالعہ سامنے آسکتا ہے۔

(۵)

ایک نادر فارسی غزل: ''کلیات شبلی اردو'' کی تدوین واشاعت کے بعد جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے علامہ شبلی کا فارسی کلیات بھی شائع کیا۔ مگر اس کے جمع وتدوین میں وہ اہتمام نہیں جو کلیات شبلی اردو کی اشاعت میں تھا۔ حتیٰ کہ بغیر دیباچہ ہی کے شائع کر دیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کے کلام کا کچھ حصہ اس میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ اس کی اشاعت کے بعد علامہ شبلی کا جو کلام دریافت ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے بعد کے مدیران معارف نے انہیں شائع کر کے محفوظ کرنے کا اہتمام کرتے رہے۔ معارف کے علاوہ بعض دوسری کتب ورسائل میں بھی علامہ شبلی کا کلام شائع ہوتا تھا۔ ''نوادرات شبلی'' میں سب کو یکجا کر دیا گیا۔

علامہ شبلی کی ایک اور فارسی غزل جو مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳۔۱۹۵۶) کے ماہنامہ پنجاب ریویو لاہور میں شائع ہوئی اور جو ''کلیات شبلی فارسی'' میں شامل نہیں ہے دستیاب ہوئی۔ جو یہ ہے:

گرتوامروز بہ سوئے من شیدا آئی	شرط باشد کہ بہ فرمان دل ما آئی
رخ برافروختہ وخوئے زدہ وزمزمہ سنج	کاکل آشفتہ ومست مے وصہبا آئی
چنگ دردست،وقدح برکف،وزنار بدوش	وازوو گیسو،زودسو، سلسلہ برپا آئی
یادبادت کہ چساں آمدہ بودی شب دوش	باز خواہم بہ ہماں شیوۂ زیبا آئی
نفسے چند بیاسائی ودر نشئہ مے	باز برخیزی وتادامن دریا آئی
درخود آں نشئۂ دوشینہ نداری درسر	ہم برآں شیوۂ دوشینہ بعمد آئی
توبہ ہر شیوۂ وآئین کہ بیائی خوب است	خوب تراز ہمہ آن است کہ تنہا آئی
خوش بود ایں کہ دگربارہ بیائی امروز	ورنہ برگفتۂ خود باش، کہ فردا آئی
نوشے از لعل لب خویش بہ سویش بفرست	ورنہ شیدائے تواز جاں گذرد تا آئی
شبلی!ازصومعہ تامیکدہ رہ نیست دراز	فرصت امروز نگہ دار کہ باما آئی(۸)

مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۱۱ء میں لاہور سے ماہنامہ پنجاب ریویو جاری کیا تھا۔جو تقریباًایک ہی سال میں بند ہوگیا۔مگراس میں علامہ شبلی کی کئی تحریریں شائع ہوئیں۔مولانا ظفر علی خاں جنہوں نے کئی رسائل جاری کیے اور علامہ شبلی نے ہمیشہ انہیں اپنے مقالات،غزلیں اور نظمیں فراہم کیں۔جن کو مولانا ظفر علی خاں ایک عزیز شاگرد کی طرح ان سے حاصل کرلیتے۔علامہ شبلی ۲۵؍فروری ۱۹۱۱ء کو مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے۔وہاں انہوں نے ''مسلمانوں کے خواب کی تعبیر'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی۔مولانا ظفر علی خاں نے اسے پنجاب ریویو میں شائع کرتے ہوئے لکھاکہ

> ۲۵؍فروری کو پنجاب کے مسلمانوں کا جو عظیم الشان جلسہ لاہور میں ''اسلامی یونیورسٹی'' کے مقاصد کی تائیداوراس کے واسطے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے منعقد ہواتھا۔اس میں جناب علامہ شبلی نعمانی مدظلہم نے ایک بلیغ نظم ارشاد فرمائی تھی۔،جس کے ایک ایک مصرعہ نے ان ہزارہاسامعین سے جواس موقع پر موجود تھے خراج تحسین وصول کیا۔یہ نظم علامہ ممدوح نے اس شفقت آمیز توجہ کے اقتضا سے ،جو ایک بلند پایہ استاد اپنے کسی ہیچ مایہ شاگرد کے حال پر مبذول کیا کرتے ہیں، ہمیں پنجاب ریویو میں شائع کرنے کی غرض سے مرحمت فرمائی تھی۔

(۹)

(۶)

غزل کے دو اشعار: علامہ شبلی نے ۲۴؍ جولائی ۱۹۱۱ء کو ایک فارسی غزل نظام المشائخ میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی جو ستمبر ۱۹۱۱ء [ص ۲] میں ''غزل تازہ خاص برائے نظام المشائخ'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ غزل چار شعر اور مقطع پر مشتمل ہے۔ مگر کلیات میں محض دو شعر ہی نقل ہوئے ہیں۔ درج ذیل دونوں شعر کلیات میں شامل نہیں ہیں:

تو کیستی؟ ز کجائی؟ چگونہ؟ اے صبر!
بباش تا قدرے با تو آشنا گردم
ز من، وداع بگوئید دوست داراں را
من آں نیم کہ بہ بند آیم و رہا گردم (۱۰)

ان اشعار کا کلیات میں شامل نہیں ہو سکنے کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔

(۷)

رام پور میں لکچر: ۱۸۹۰ء میں علامہ شبلی نعمانی نے رام پور کا سفر کیا اور وہاں کئی لکچر دیے۔ ریاست رام پور کی ۱۸۸۹ـ۱۸۹۰ء کی مطبوعہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ

اگست ۹۰ء میں مولوی شبلی صاحب پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ مہمانانہ وارد ریاست ہوئے تھے۔ اور بعض علم دوست احباب کی تحریک سے باجازت کونسل آف ریجنسی مولوی صاحب نے مکان ظفر منزل میں (جو ایک عالیشان عمارت ہے۔) دو لکچر دیے تھے۔ ایک اثبات نبوت پر۔ دوسرا سبجکٹ یہ تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلایا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ اردو میں (شارٹ ہینڈ) کی قاعدہ نہ ہونے سے یہ لکچر چھپ نہ سکے اور سامعین کو لذت استماع نے فرصت بھی نہ دی کہ کچھ لکھ لیا جاتا۔ ان لکچروں میں اس کا التزام کیا گیا تھا کہ کسی مذہب کی توہین کا پہلو نہ پیدا ہو معزز ممبران صاحبان و اہل کاران ریاست و روسائے شہر نہایت رغبت سے ان جلسوں میں شریک ہوئے کہ اب تک مولوی صاحب کی لطافت اور فدویت بیان کے شکر گذار ہیں۔ (۱۱)

رام پور کے اس سفر کا ذکر ''حیات شبلی'' میں رہ گیا۔

(۸)

بمبئی میں لکچر: پیسہ اخبار لاہور میں یہ خبر نظر سے گذری، غالباً اس کا ذکر اب تک کہیں نہیں ہوا۔ خبر یہ

ہے:

بمبئی[۲، ستمبر ۱۹۰۶ء]آج شمس العلماء مولانا شبلی کا وعظ ہوا۔اس جلسہ میں جس کے صدر جناب مولوی رفیع احمد صاحب بیر سٹر ایٹ لا بنائے گئے تھے۔قریب پانچ چھ سو کے حاضرین نظر آتے تھے۔ تمام ہال بھرا ہوا تھا۔ بہت سے آدمی کرسیوں کے پر ہو جانے کی وجہ سے کھڑے تھے۔ مولانا شبلی نے چار بج کر ۴۴ منٹ پر تقریر شروع کی اور پورے چھ بجے تک بیان فرماتے رہے۔ وعظ مذکور جو ''اشاعت اسلام'' کے مسئلہ پر تھا، نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ایسی ایسی عمدہ باتیں بیان کیں کہ سننے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تمام حاضرین نہایت خوش ہوئے اور آپ کے نہایت پر مغز اور مدلل وعظ کو بڑی دلچسپی سے سنا۔ سامعین میں سے بعض بعض اصحاب نے دوبارہ مولانا صاحب کا وعظ سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔اور مولانا صاحب کی بہت کچھ تعریف کی۔ پھر صدر نشیں جناب مولوی رفیع الدین صاحب نے مولانا شبلی کی بہت کچھ صفت و ثنا کی اور وعظ کی نسبت بڑی تعریف کے ساتھ فرمایا اور کہا کہ ایسے عمدہ لکچر سننے کا مجھ کو بہت کم اتفاق ہوا ہے۔اس پر مولانا شبلی نے مذاقاً کہا کہ آپ لکچر نہ کہیے بلکہ وعظ کہیے۔

حاجی یوسف حاجی اسماعیل صاحب سکریٹری انجمن اسلام نے مولانا شبلی کے وعظ کے سننے کی نسبت لوگوں کا غیر معمولی اشتیاق دیکھ کر ظاہر کیا کہ مرحوم بدرالدین طیب جی کے انتقال کی وجہ سے تاخیر ہوئی اب عنقریب مولانا ممدوح کا وعظ انجمن اسلام میں کرایا جائے گا۔(۱۲)

(۹)

بنارس میں اجلاس ندوہ: ندوۃ العلماء کے گیارہویں سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس کے حوالہ سے علامہ شبلی نعمانی کی ایک مختصر تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ یہ دراصل اخبارات کے لیے تھی۔ یہ بھی پیسہ اخبار لاہور کا عطیہ ہے:

ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ گذشتہ جلسوں سے بھی باعتبار عظمت و شان کے فائق ہوگا۔اس جلسہ میں ایک خاص بات یہ ہوگی کہ دارالعلوم کی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کیا جائے گا۔اور شرکائے جلسہ کو اس بات کے جانچنے کا موقع ملے گا کہ طلبائے دارالعلوم کو دیگر مدارس کے طلبا پر کن چیزوں میں فوقیت حاصل ہے۔

دوسری چیز جو تمام جلسوں سے خاص و مزید ہوگی وہ یہ ہے کہ کتب قدیمہ، فرامین شاہی اور قطعات وغیرہ کی نمائش اسی جلسہ کے ساتھ کھولی جائے گی۔ پس جو حضرات شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں وہ کم از کم ایک ہفتہ پیشتر اپنی روانگی سے جناب مولوی مقبول عالم صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل بنارس کو اطلاع

دیں تاکہ ان کے استقبال و قیام کا پہلے سے مناسب انتظام کیا جاسکے"۔(۱۳)

تعلیقات و حواشی

(۱) ماہنامہ معارف اپریل ۲۰۱۹ء ص ۲۵۹۔

(۲) حسام الاسلام ص ۲۲۷۔

(۳) مجالس حکیم الامت، ماہنامہ البلاغ کراچی مارچ ۱۹۷۰ء ص ۴۰-۳۹۔

(۴) حیات شبلی ص ۶۳۰۔

(۵) روزنامہ پیسہ اخبار، ۱۱/ اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۳۔

(۶) روزنامہ پیسہ اخبار ۱۷/ اکتوبر ۱۹۰۶ء، ص ۱۶۔

(۷) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، جلد ۲ نمبر ۴، ص ۴۵۔

(۸) ماہنامہ، پنجاب ریویو لاہور مئی جون ۱۹۱۱ء ص ۶۴۔

(۹) ایضاً ص ۴۶۔(۱۰) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، ستمبر ۱۹۱۱ء ص ۲۔

(۱۱) رپورٹ انتظامیہ ریاست رامپور سنہ ۹۰،۸۹ء ص ۲۱۴ مطبوعہ دبدبہ سکندری پریس رام پور۔

(۱۲) پیسہ اخبار، لاہور، ۳ ستمبر ۱۹۰۶ء ص ۲۱۔

(۱۳) پیسہ اخبار، لاہور، ۱۰/ مارچ ۱۹۰۶ء، ص ۱۱۔

اخبار علمیہ

مسلمانان اندلس کے متعلق ایک اہم دستاویزی کتاب

اسپین کی آخری مسلم سلطنت غرناطہ (گریناڈا) کو ۱۴۹۲ء میں فتح کرنے کے بعد کیتھولک فرماں رواؤں نے غرناطہ کے مسلمانوں کو جبراً عیسائیت قبول کرنے کے لیے قانون بنایا تھا۔ اس قانون کو نہ ماننے پر جلاوطن ہونا پڑتا تھا۔ اکثریت نے جلاوطنی کے بجائے تبدیلی مذہب یعنی عیسائیت کو اپنا تحفظ سمجھ کر ظاہراً قبول کر لیا تھا۔ لیکن ابھی حال ہی میں ایک انتہائی اہم دستاویزی کتاب محاکم التفتیش: تحقیق لثلاثۃ و عشرین ملفا لقضایا ضد المسلمین فی الاندلس (جلد اول و دوم) منظر عام پر آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گذرنے کے بعد بھی مسلمانوں نے اپنی زبان، رسم و رواج اور اپنی مذہبی روایات اور طور طریقوں کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے کی جو قانونی کوشش و سازش کیتھولک بادشاہوں کی طرف سے کی گئی تھی اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ اس کتاب میں مسلمانان اندلس کے خلاف دائر کیے گئے کل تیئس مقدمات کی تفتیش کی گئی ہے۔ مقدمات کی اس قدر کمی اس مجموعہ کو مزید اہم بناتی اور حکام کی ناکامی کو ظاہر کرتی ہے۔ محاکم تفتیش (عیسائی مذہبی کورٹ Inquisition) کے فیصلے انتہائی سخت ہوتے تھے۔ مقدمات کیتھولک عیسائی مردوں کی جانب سے کیے جاتے تھے، سر عام فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ الزام سے انکار کرنے پر ملزم کو وہیں جلا دیا جاتا تھا اور اقرار کرنے پر چند برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ اسی وجہ سے اکثر ملزمین اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر لیتے تھے۔ اس قسم کا سب سے پہلا فیصلہ اشبیلیہ (Seville) میں ۱۴۸۱ء میں سنایا گیا۔ مدعا علیہ بالعموم شائستہ اور مہذب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہوں نے اپنے روایتی کردار میں اپنے بچوں کی مذہبی ثقافت پر اثر ڈالا۔ تین مسلم خواتین ''ماریا البا کین، ماریا میغمغ اور اینیس دی لاسیرنا'' کو ایک محکمہ تفتیش کے سامنے جسے ''اوٹو ڈوفی'' کہا جاتا تھا پیش کیا گیا۔ اپنے مذہب اور طرز حیات کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں کی جانب سے البشرات کی بغاوت آخری کوشش تھی۔ ایک گواہ کے مطابق مسلمان بہت پر امید تھے کہ ترک غرناطہ کو فتح کر لیں گے اور اس طرح وہ اپنے مذہب پر آزادانہ عمل کر سکیں گے لیکن یکم جنوری ۱۵۶۷ء میں شاہ فلپ کے ظالمانہ اور

انسانیت سوز اقدام سے اس بغاوت کو کچل دیا گیا اور مسلمانوں کی اکثریت کو غرناطہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ کتاب کا اختتام ان مشہور محاکم تفتیش کے اہم اعداد و شمار پر کیا گیا ہے جن کا سلسلہ نومبر ۱۴۷۸ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۴ء میں اس کے اختتام تک جاری رہا اور اس میں پانچ لاکھ بے قصور مسلمانوں کی جانیں گئیں۔ اصلاً یہ کتاب دو جلدوں میں اسپینی زبان میں تھی۔ جلد اول میں ۶۳۸ اور جلد دوم میں ۶۱۰ صفحات ہیں۔ اسپینی زبان سے سے عربی ترجمہ محمد نذیر الحمصی اور اس کی تحقیق الشارقہ کے حاکم ڈاکٹر شیخ سلطان القاسمی نے کی ہے۔ اس میں کل ۱۳۹۶ صفحات ہیں۔ پہلی جلد میں ۷۱۲ اور دوسری میں ۶۷۸ صفحات ہیں۔ اس کی پی ڈی ایف فائل انٹرنٹ پر موجود ہے جس کا لنک درج ذیل ہے:
https://archive.org/details/20210916-20210916-2116

دوبارہ قوت مدافعت کے خاتمہ کے امکان پر ایک تحقیق

برطانیہ کی سلامتی صحت ایجنسی نے اپنی ویک ۴۲ ''کووڈ۔۱۹ ویکسین پر نظر رکھنے کی رپورٹ'' میں ص ۲۳ پر یہ اعتراف کیا ہے کہ ''جن افراد کو ٹیکہ کی دو خوراکیں لینے کے بعد انفیکشن ہو جاتا ہے ان میں اینٹی باڈی لیول گر جاتا ہے''۔ اس کی وضاحت کے مطابق اینٹی باڈی کی یہ کمی بنیادی طور پر مستقل ہو جاتی ہے۔ نیچرل نیوز کے بموجب الیکس بیرنس نے تحریر کیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کئی چیزیں ہیں سب کی سب بری اور خراب ہیں۔ ہم جانتے ہیں ٹیکوں سے نہ تو انفیکشن رکتا ہے اور نہ ہی وائرس کی منتقلی کی روک تھام ہوتی ہے (درحقیقت رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو بالغ افراد ٹیکے لے لیتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں انفیکشن سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جنھوں نے ٹیکے نہیں لگوائے ہیں) خدا پر بھروسہ رکھیں۔ بڑے بڑے فرما پر اعتماد نہ کریں۔ دراصل یہ دو حقیقتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ٹیکہ نہ لینے والے قوت مدافعت کے ساتھ خدا پر توکل اور ٹیکہ لینے والے سائنس پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ ان دونوں حقیقتوں میں سے ایک صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ ٹیکہ لینے والوں کی قوت مدافعت کو مستقل طور پر نقصان پہنچ رہا ہے اور جو نہیں لے رہے ہیں ان کی قدرتی مدافعت اچھی رہ رہی ہے اور وہ وائرس کے حملہ سے کامیابی کے ساتھ سامنا کرنے کے قابل ہیں۔ اس میں صحیح بات یہ ہے کہ جن میں علامات ظاہر نہ ہوں ان کو ٹیکہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

(منصف حیدرآباد، ۲۰؍اکتوبر ۲۱ء، بین الاقوامی، ص۵)

ہندو تہذیب و ہندو مت پر دو کتابیں

ہندوستان میں جو قومیں بود و باش رکھتی ہیں ان کو اس ملک کی قدیم تہذیب اور دیرینہ مذہبی روایتوں سے

واقف ہونا ضروری ہے۔اس سے واقفیت کے لیے سب سے بنیادی اور اہم ذریعہ کتابیں ہیں۔ابھی حال ہی میں انگریزی میں ہندو تہذیب پر ایک کتاب ''دی گریٹ ہندو سویلائزیشن'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔اس کے مصنف پون کے ورما ہیں۔دوسری کتاب ہندومت پر ''منو کا ودھان'' نام سے ہے۔اس کے مصنف ستیش آلوک ہیں۔ان دونوں کتابوں پر مختصر مگر جامع تبصرہ ایک ہندی روزنامہ میں شائع ہوا ہے۔

اول الذکر کتاب کے متعلق تبصرہ میں کہا گیا ہے کہ بہت سارے مغربی اور ہندو مخالف مورخین کا کہنا ہے کہ عہد قدیم میں ہندو دھرم کا کوئی وجود نہیں ہے۔بلکہ یہ نوآبادیاتی یا مستعمراتی عہد کا ایک نظریہ ہے اور ہندو دھرم محض اب ماضی کی باقیات ہے۔مصنف نے ہندو دھرم اور اس کی تہذیب کے متعلق محققین کے اس نظریہ کی پرزور تردید کی ہے اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ بلاشبہہ عظیم ہندو تہذیب کا وجود پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ اس تہذیب سے سب سے زیادہ خود ہندوؤں کی واقفیت ضروری ہے جو بالعموم ہندوؤں میں کم پائی جاتی ہے۔اس میں ۶ ابواب ہیں۔مصنف نے ہندو مذہب پر اسلام کے حملوں اور برطانوی سامراج کے اثرات کے تجزیہ کے ساتھ مستقبل کے چیلنجز کی نشان دہی بھی کی ہے۔مختلف نظریات کے حامل لوگ اس کتاب کے متعدد تحقیقات و مشتملات اور تجزیہ سے اتفاق نہیں کریں گے تاہم ہندو تہذیب پر یہ ایک اچھا تجزیہ ہے۔ویسٹ لینڈ، چنئی سے شائع ہوئی ہے۔

دوسری کتاب ''منو کا ودھان'' پر تبصرہ میں کہا گیا ہے کہ احترام نسواں اور عمل کی بنیاد پر برادریوں کی تقسیم کے اعلان کے باوجود ''منواسمرتی'' کے خلاف عدم اتفاق کی آواز آج بھی زندہ و بلند ہے لیکن آج اس کی شہرت اور گفتگو کی وجہ ستیش آلوک کی کتاب ''منو کا ودھان'' ہے۔تبصرہ کے مطابق تقریباً چار ہزار برس پہلے لکھی گئی منواسمرتی مذہبی کتاب نہیں ہے۔یہ کتاب ویدک نظریات کی حمایت کرتی ہے، ویدوں اور پنڈتوں کو معاشرہ میں خصوصی عزت و احترام دینے کی بات کرنے والی اسمرتی میں معاشرہ میں ترقی اور حکومتی نظم و نسق کے قیام کے متعلق بھی ملتے ہیں۔کتاب میں کل ۱۲ ابواب کے تحت تخلیق کائنات، کام، مذہب، زراعت اور قوانین کفارہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔مبصر نے اس کی سب سے اہم خوبی و خاصیت مصنف کا اس کے اشلوکوں کو عام، آسان اور قابل فہم ہندی میں بیان کر دینا بتایا ہے۔اس کا یہ خلاصہ مصنف نے اپنی فہم و بصیرت اور وقت و ضرورت کے تقاضہ کے مطابق کیا ہے۔یہ کتاب پر کھر پرکاشن، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

(ہندوستان، وارانسی (ہندی) ۹؍۱۰؍۲۱ء، ص ۱۱)

کلیم صفات اصلاحی

تبصرۂ کتب

”صوفیہ پنجاب: ایک سوانحی مطالعہ“
ایک غیر مرتب، غیر مستند ماخذ

ڈاکٹر عارف نوشاہی

arifnaushahi@gmail.com

جولائی ۲۰۱۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر عزیز الدین حسین سے تہران میں اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ ہم تہران میں ایک ہی سرکاری مہمان خانے میں قیام پذیر تھے۔اس مختصر ملاقات میں، میں نے انھیں کم گو، خاموش طبع اور شریف النفس انسان پایا۔وہ اس وقت رامپور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر تھے۔ طبعی طور پر مجھے لائبریری کے مخطوطات اور فارسی کتب کی اشاعت کے حوالے سے دلچسپی تھی۔جب ہم اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے تو کچھ عرصہ بذریعہ ایمیل رابطہ رہا۔ اس طرح ہمارے درمیان آشنائی کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ۲۰۲۰ء میں ان کی طرف سے ایک بار پھر رابطہ ہوا۔انہوں نے لاہور کے چند مشائخ کی ایک فہرست بھیجی اور ان کے مقابر کے موجودہ محل وقوع کے بارے میں استفسار کیا جس کا میں نے اپنی دانست اور مفتی غلام سرور لاہوری کی حدیقۃ الاولیا مرتّبہ محمد اقبال مجددی کی مدد سے جواب دے دیا۔ اس رابطے سے معلوم ہوا کہ وہ پنجاب کے بارہویں تا اٹھارہویں صدی عیسوی کے صوفیہ پر ایک انگریزی کتاب لکھ رہے ہیں اور یہ استفسار اُسی سلسلے میں تھا۔ پنجابی ہونے اور پنجاب کے ایک سلسلۂ صوفیہ سے وابستگی کے ناتے سے مجھے اس کتاب کی اشاعت کا بے تابی سے انتظار تھا۔اوائل ۲۰۲۱ء میں عزیز الدین حسین صاحب کی یہ انگریزی کتاب *Sufis of Punjab: A Biographical Study* نام سے کنشکا پبلشرز، نئی دہلی نے ۱۲+۱۶۰ صفحات میں شائع کر دی اور اگست ۲۰۲۱ء میں مجھ تک پہنچی۔ یہ انڈین کاؤنسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، وزارت ایچ آر ڈی، حکومت ہند کی طرف سے سینئر اکیڈمک فیلوشپ کے تحت مصنف کو دیے گئے ایک بڑے منصوبے کی پہلی جلد ہے۔ پنجاب سے متعلق ایک جلد اور آئے گی اور اس کے بعد مزید جلدیں جنوبی ایشیا کے دیگر علاقوں کشمیر، دکن، بنگال وغیرہ کے صوفیہ کے سوانحی تذکرے پر مشتمل ہوں گی۔ زیر نظر جلد میں مصنف نے پنجاب کا تاریخی جغرافیا پیش نظر رکھا ہے اور اس میں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم شدہ پنجاب کے تمام علاقے شامل ہیں۔ صوفیہ کے حالات میں مصنف نے

اختصار کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر ایک کے بارے میں چند سطری معلومات دی ہیں۔ شیخ علی ہجویری صاحب کشف المحجوب پر سب سے طویل مضمون ہے۔

مجھے کتاب کا اس لیے بھی انتظار تھا کہ دیکھوں مصنف نے پنجاب کے ایک معروف سلسلہ صوفیہ ''نوشاہیہ'' کے بزرگوں کا ذکر کس حد تک کیا ہے؟ کتاب دیکھنے کا جس قدر اشتیاق تھا، اسے دیکھ کر اُسی قدر مایوسی ہوئی۔ اس مایوسی کی کئی وجوہات ہیں:

الف: کتاب میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے۔ نہ تاریخی، نہ الف بائی، نہ سلاسل وار۔

ب: کتاب میں درج معلومات کا موقع پر کوئی حوالہ نہیں ہے اور محض آخر میں فہرست کتب حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس صوفی کے حالات کس کتاب سے لیے گئے ہیں۔

ج: کتاب میں جا بجا تاریخی اور واقعاتی اغلاط ہیں۔

د: بعض اشخاص اور جگہوں کے ناموں کی رومن نقل حرفی درست نہیں ہے۔

ہ: پروف خوانی میں دقّت نظر نہیں ہے۔

و: بعض اندراجات مکرّر ہیں۔

ز: کتاب کے صفحات ۱۴۹ تا ۱۵۵ کتابیات یا Bibliography میں بھی قطعاً کوئی نظم یا ترتیب نہیں ہے، مصنف یا کتاب کے ناموں کی ترتیب باعتبار تہجی مفقود ہے۔

ح: مصنف نے کتاب کے آخر میں اشخاص، کتب اور مقامات کا ایک مشترکہ اشاریہ بھی دیا ہے۔ لوگوں کے القاب جیسے پروفیسر، پیر، خواجہ، ڈاکٹر، شیخ، مفتی، مولانا وغیرہ کو مقدّم رکھا ہے اور اصل نام بعد میں درج کیا ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ دوسری بات، یہ ایک نامکمل اشاریہ ہے۔ کتاب میں مذکور کتنے ہی لوگوں، جگہوں اور کتابوں کے نام اشاریے میں شامل نہیں کیے گئے۔ موجودہ اشاریے کی ترتیب میں بے اصولی اور متعدد اسما کو نظر انداز کر دینے سے اس کی افادیت محدود ہو گئی ہے۔

ط: صرف سنہ کا استعمال کیا ہے، تاریخ و مہینہ کا ذکر نہیں ہے۔

ی: قدیم تذکروں میں سنہ ہجری کا استعمال ہوتا تھا، مصنف نے عیسوی مطابقت بھی درج کی ہے لیکن وہ بھی درست نہیں۔ بعض اوقات ہجری کا ایک سال عیسوی کے دو نصف برسوں پر محیط ہوتا ہے۔ مصنف نے عیسوی سال کے صرف پہلے حصے کو لکھا ہے، موخر حصے کو چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز الدین حسین دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے

شعبۂ تاریخ کے صدر اور بعد میں ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجیز رہے ہیں۔ چند سال رامپور رضا لائبریری میں بھی بطور ڈائریکٹر کام کیا ہے۔ یہ ہندوستان کے بڑے علمی ادارے ہیں۔ ہمیں ان اداروں سے وابستہ رہنے والے ایک مورّخ اور عالم شخص سے اس کے شایان شان کتاب کی توقع تھی۔ لیکن معلوم نہیں انھوں نے کس اصول تحقیق کے تحت ایک بے سند کتاب لکھ دی ہے۔ ان سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر نبی ہادی مرحوم بھی اپنی دو کتابوں *Dictionary of Indo-Persian Literature* اور *History of Indo-Persian Literature* میں یہ نظیر قائم کر چکے ہیں کہ کسی اندراج کے نیچے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ ثقہ علمی حلقوں میں ایسی کتابوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ مصنف کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے کہ وہ کسی اندراج کا حوالہ نہیں دیتے۔ بعض مصنفین کے ذہن میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی دوسری کتاب کا حوالہ دیں گے تو ان کی اپنی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دے گا۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ حوالہ نہ دینے کی صورت میں کتاب کی تمام غلطیوں کے ذمے دار وہی ٹھہرائے جائیں گے۔

کتاب کی ترتیب کا یہ عالم ہے کہ اس میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ نہ تاریخی، نہ الف بائی اور نہ سلاسل تصوف کی۔ بس جہاں جی چاہا نام درج کر کے اس شخص کے حالات لکھ دیئے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ مصنف کی یادداشتوں کا مجموعہ یا مسودہ ہے، جس میں جو چیز جیسے اور جہاں نوٹ کی، اسے بلا تحقیق، ترتیب و نظم کمپوز کروا کر چھپوا دیا۔ کتاب کی ابتدا درست طور پر شیخ علی ہجویری سے ہوئی ہے کہ پنجاب کے متقدم ترین عارف وہی ہیں۔ اس سے قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید مصنف نے تاریخی اور زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہوگا۔ لیکن ہجویری کے فوراً بعد اگلا اندراج غلام سرور لاہوری کا ہے جو برطانوی دور کے مصنف ہیں۔ اس کے بعد کتاب میں بے ترتیبی کا سلسلہ آخر تک قائم رہتا ہے۔

میں نے زیر بحث کتاب میں سلسلۂ نوشاہیہ کے رجال پر درج معلومات پر ایک نظر ڈالی تو ان میں طرح طرح کی غلطیاں پائیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باقی سلاسل کے مشایخ پر دی گئی معلومات کا کیا حال ہوگا۔ یہاں صفحہ وار چند ایک تسامحات کی نشان دہی کی جاتی ہے اور ہر اندراج کے بعد قوسین میں اپنا ماخذ بتا دیا ہے۔ میں نے جن ماخذ کا ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ مصنف کی کتابیات میں بھی مندرج ہیں یعنی یہ کتابیں مصنف کے پیش نظر رہی ہیں۔ لیکن انھوں نے بالاستیعاب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

- ص ۶: پر مصنف نے ایک نوشاہی کاتب فتح محمد بن عصمت اللہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی کتابت کردہ کتب کے نام لکھے ہیں۔ یہ فتح محمد کاتب، عصمت اللہ کے بیٹے نہیں بلکہ مرید تھے (شریف التواریخ، ج ۳،

ج۲، ص۱۸۵)۔ مصنف نے ان کی کتابت کردہ کتب میں سے پَند نامہ کو انگریزی میں Pind Nama لکھا ہے۔ علم صرف کی معروف کتاب زرّادی کو Zaudi لکھا ہے۔

- ص۳۵: پر غلام سرور لاہوری بن مفتی غلام محمد کا تین سطری ذکر ہے اور ص۳۶ پر مفتی حکیم غلام سرور لاہوری عنوان سے دوبارہ اسی شخصیت کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ان کے والد کا ذکر پہلے صفحہ ۳۵ اور دوبارہ صفحہ ۵۶ پر ہے۔ اس غلطی کی بنیادی وجہ وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا کہ موصوف نے کسی اصول کے تحت یہ کتاب ترتیب نہیں دی بلکہ جن کے حالات اُنھیں ملتے گئے، یادداشت کے طور پر اسے نقل کرتے گئے اور وہی مسودہ غالباً کمپوزر کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے اسے بعینہٖ بلا ترتیب کمپوز کر دیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مصنف ان صوفیہ کے ناموں کے کارڈ بناتے اور پھر اُنھیں الف بائی ترتیب دیتے تو ناموں کی تکرار نہیں ہوتی۔

- ص۳۷: شاہ لطیف بری قادری کا سال وفات ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء اور مزار لاہور میں لکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ۹۶۴ھ کی عیسوی مطابقت ۴ نومبر ۱۵۵۶ء سے ۲۳ اکتوبر ۱۵۵۷ء ہے لہٰذا اسے ۹۶۴/ ۵۷-۱۵۵۶ء لکھنا چاہیے۔ دیگر یہ کہ ان کا سال وفات ۹۶۴ھ نہیں، ۱۱۱۷ھ ہے اور مزار لاہور سے تین سو کلومیٹر دور اسلام آباد کے قریب نور پور شاہاں میں واقع ہے۔ (شاہ لطیف بری از منظور الحق صدیقی، ص۳۸)

- ص۳۸: شاہ معروف چشتی قادری پر چار سطری مضمون میں تین غلطیاں ہیں۔ اول ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے پنجاب میں سلسلۂ نوشاہیہ کو فروغ دیا (He promoted Noshahiya Silsilah in Punjab)۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ سلسلۂ نوشاہیہ کا ظہور، شاہ معروف کے مرید شاہ سلیمان بھلوالی کے مرید حاجی محمد نوشاہ گنج بخش (۹۵۹-۱۰۶۴ھ) سے ہوا لہٰذا شاہ معروف کی طرف سے نوشاہیہ کو فروغ دینا کیسا جو اس وقت موجود ہی نہیں تھا؟ دوسرا لکھا ہے کہ ان کے مزار کے محل وقوع کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ ان کا مزار خوشاب پنجاب میں ہے اور تذکروں میں ذکر ملتا ہے۔ (شریف التواریخ، ج۱، ص۸۷۸)۔ تیسرا شاہ معروف کی وفات کی تاریخ ۹۷۸ھ لکھی ہے جب کہ درست تاریخ ۹۸۷ھ ہے۔ (شریف التواریخ، ج۱، ص۸۷۸؛ تذکرۂ نوشاہیہ، تعلیقات، ص۲۷۱)

- ص۴۰: شاہ سلیمان قادری؛ ان کے مقام بھلوال کو رومن نقل حرفی میں بھیلووال (Bhilowal) بنادیا

ہے۔ان کی تاریخ وفات ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء غلط لکھی ہے (عیسوی مطابقت میں بھی ۵۵۔۱۶۵۴ء ہونا چاہیے)۔ان کا درست سال وفات ۱۰۱۲ھ ہے ان کے مزار کے بارے میں لکھا ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے محل وقوع کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ ان کے مزار واقع بھلوال کا سب نے تذکرہ کیا ہے۔(شریف التواریخ، ج۱، ص۹۱۲)

-ص۴۱: شیخ حاجی محمد قادری کے حالات میں لکھا ہے: ''ان کی وفات ۱۱۰۳ھ /۱۶۹۱ء میں ہوئی لیکن درست تاریخ وفات ۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ /۱۶۵۳ء ہے''۔ مصنف کا انگریزی جملہ یہ ہے:

But correct date of his death is 8th Rabiul Awwal 1064/1653. He died in 1103/1691.

مصنف کا یہ جملہ غیر فصیح اور معکوس ہے۔یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ان کی وفات ۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ کو ہوئی، ۱۱۰۳ سال وفات درست نہیں ہے۔دیگر یہ کہ ۸ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ کی عیسوی مطابقت ۱۷ جنوری ۱۶۵۴ء ہوتی ہے ۱۶۵۳ء نہیں۔ان کے حالات کے آخر میں لفظ ''کرونو گرام'' لکھ کر آگے مادّہ تاریخ درج نہیں ہوا۔ حضرت حاجی محمد نوشاہ گنج بخش کی تاریخ وفات میں اختلاف پیش آنے کے پس منظر کو جاننے کے لیے ملاحظہ ہو راقم السطور کا رسالہ: حضرت نوشہ گنج بخش تاریخ وفات اور وطن کی تحقیق، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۰ء

-ص۵۳: معروف عالم دین مولانا عبدالحکیم سیال کوٹی کا نام عبدالحلیم سیال کوٹی لکھا ہے۔

-ص۵۷: سید شاہ عبداللہ مجذوب نوشاہی کو شیخ محمد جبار نوشہ کا مرید لکھا ہے۔ شیخ محمد جبار نوشہ نام سے کوئی شیخ سلسلۂ نوشاہیہ میں نہیں گذرے۔یہ شاہ عبداللہ حضرت نوشاہ گنج بخش کے مرید تھے۔(شریف التواریخ، ج۳، ح۱، ص۳۴۱)

-ص۵۷و۵۸: تانو مجذوب نوشاہی کا مزار موضع کلاسکی چمیہ [Chamia] ضلع گجرات لکھا ہے۔درست نام کلاسکی چیمہ [Cheema] ہے اور یہ ضلع گوجرانوالا میں ہے۔ (تذکرۂ نوشاہیہ، ص ۱۸۱؛ شریف التواریخ، ج۳، ح۱، ص۵۱۱)

-ص۹۰و۹۱: فقیر فضل الدین گوندلاں والیہ کو گوندھاں والیہ(Gondhanwalia) لکھا ہے۔ اور آگے چل کر اس جگہ کا نام گوند لانو والا (Gond Lanowala) علاحدہ علاحدہ لکھا ہے۔اسی ضمن میں ص۹۱ پر فارسی مصرعہ میں بھی غلط طور پر گونہ لانوالہ درج ہوا ہے۔انھیں فارسی اور اردو شاعر بتایا ہے اور ایک ایک شعر نقل کیا ہے۔ فقیر فضل الدین کے شاعر ہونے کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ مصنف نے جو

دو اشعار نقل کیے ہیں وہ ان کے خاندان کے ایک معاصر شاعر محمد افضل طور (وفات: یکم جنوری ۱۹۸۲ء) کے ہیں۔ (شریف التواریخ، ج۳، ح۵، ص۱۰۶۔۱۰۷)

-ص۹۴: میاں غلام حسین کے مدفن کا نام بڑھکی بُدھال ہے، مصنف نے Buhal لکھا ہے۔ (شریف التواریخ، ج۳، ح۶، ص۱۰۸)

-ص۹۴و۹۵: سائیں غلام محمد پوٹھوہاری کا مدفن پنڈ بینسو، تحصیل گوجرانوالہ، ضلع راولپنڈی لکھا ہے۔ تحصیل گوجر خان ہونا چاہیے۔ (شریف التواریخ، ج۳، ح۶، ص۱۲۰)

-ص۹۵: فقیر سید نورالدین بخاری کے شیخ طریقت کا نام Pagluddin لکھا ہے۔ یہ کیا نام ہوا؟ درست نام فضل الدین ہے۔ (تذکرۂ شعرائے نوشاہیہ، ص۳۰۷؛ شریف التواریخ، ج۳، ح۶، ص۲۵۱)

-ص۹۶: احمد یار مرالوی کا پنجابی شعر غلط لکھا ہے۔ بنیال کی جگہ نبیاں ہونا چاہیے۔ (شریف التواریخ، ج۳، ح۷، ص۱۱)

-ص۹۶: احمد یار مرالوی کی صرف گیارہ کتابوں کی فہرست دی ہے جبکہ تقریباً پچاس تصنیفات ان کی یادگار ہیں اور سبھی کے نام "تذکرۂ شعرائے نوشاہیہ" میں درج ہیں۔ فہرست میں ایک کتاب کا نام Habs Sakhi Sarwar Sultan لکھا ہے یہ جَس سخی سرور سلطان ہے (تذکرۂ شعرائے نوشاہیہ، ص ۵۳)۔ جَس پنجابی میں مدح یا قصیدہ کو کہتے ہیں۔

-ص۱۰۱: محمد اقبال مجددی کا نام رومن میں Mujadda اور محمد دین کلیم کا نام رومن میں Karim لکھا ہے۔-

ص۱۵۵: شریف التواریخ کا سال طباعت ۱۹۷۰ لکھا ہے، یہ غلط ہے۔ اس کی تینوں جلدوں کی اشاعت علی الترتیب ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳۔۱۹۸۴ء میں ہوئی تھی۔ (تذکرۂ شرافت نوشاہی، ص۹۴۔۹۹)

-مصنف چونکہ پنجاب کے اماکن اور رجال سے قطعاً ناواقف ہیں، انھوں نے پنجاب کے دیہات، قصبات اور بعض لوگوں کے ناموں کو رومن املا میں تبدیل کرتے وقت بہت غلطیاں کی ہیں۔ کچھ کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد نمونے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ -کتاب کی ابتدا میں پروفیسر عراق رضا زیدی سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے نتیجۂ فکر سے کتاب کا قطعۂ تاریخ طباعت درج ہے۔ قطعے کے عنوان اور مادۂ تاریخ میں لفظ صوفی کا صیغۂ جمع صوفیہ کی بجائے "صوفیا" لکھا ہے اور اعداد بھی اس کے مطابق شمار کیے ہیں! صوفی کی جمع صوفیہ ہے صوفیا نہیں۔

قصہ کوتاہ، معلوم نہیں مصنف اس غیر مستند اور غیر مرتّب کتاب کی تصنیف سے کیا مقصد حاصل کرنا

چاہتے ہیں؟ اس کے بعد کی مجوزہ جلدوں میں بھی اگر یہی منہج رہا تو یہ محض مصنف کے وقت اور گرانٹ دینے والے سرکاری ادارے اور ناشر کے پیسے کا ضیاع ہوگا۔ لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ اگلی جلدوں میں کوئی ایک نظم قائم کریں اور مآخذ کا حوالہ دیں۔ اگر مختلف تذکروں میں کسی کے حالات یا تاریخ کے معاملے میں اختلافات ہوں، تو اُنھیں اپنی تحقیق کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُن اختلافات کو پاورقی میں درج کردیں اور اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں کی صواب دید پر چھوڑ دیں۔ تبھی یہ حوالے کی کتاب بن سکتی ہے ورنہ محققین اور طالب علموں کے لیے گمراہی کا سبب بنے گی۔

قصیدہ، اصل، ہیئت اور حدود: از ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۲۴۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲۔

یہ کتاب فاضل مصنف نے اس خواہش کے ساتھ بھیجی تھی کہ اس کا ذکر جلد سے جلد آجائے۔ کیا خبر تھی کہ اس سے بھی جلد خود مصنف ہی انتظار کیے بغیر ہم سب سے رخصت ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر تعمیل حکم کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ یہ احساس البتہ رہا کہ ظفر صاحب اپنی کتابوں اور دیگر اکتسابات علمی کی وجہ سے جہان اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ کتاب غالباً ان کی آخری کتاب ہے۔ قصیدہ کے موضوع پر ان کے کئی مقالے شائع ہوئے، معارف میں بھی ایک مضمون چھپا، یہ ان کا محبوب موضوع تھا۔ تدریس میں بھی قصیدہ اور اس کے منتخب اشعار ان ہی سے متعلق رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اور اصناف شاعری کے مقابلہ میں صنف قصیدہ کچھ زیادہ مشکل ہے، اسی لیے وہ طلبہ کو زبانی تشریح کے علاوہ کچھ اہم چیزیں املا بھی کراتے تھے۔ کتاب گویا ان شرحوں کا مجموعہ ہے۔ قصیدہ کی اصل کیا ہے؟ فارسی یا عربی، ان کا کہنا تھا کہ اردوداں طبقہ قصیدہ کے عربی تصور سے نہ صرف آگاہ نہیں بلکہ اس کی نسبت شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہے۔ یہ اور کئی مباحث سے کتاب خوب سے خوب تر ہوتی جاتی ہے۔ طلبہ کے علاوہ بلند معیار کے خواہاں باذوق قارئین کے لیے یہ کتاب عمدہ تحفہ ہے۔ (ع-ص)

سخنوران اعظم گڑھ (حصہ اول الف): از مولانا قمر الزماں مبارک پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۵۲۸، قیمت ۵۵۰ روپے، پتہ: انصاری بک ڈپو، بڑی ارجنٹی، مبارک پور، اعظم گڑھ اور سرائے میر اور مئو کے مشہور مکتبے۔

علم و فضل، شعر و ادب، تحقیق و تصنیف اور سرزمین اعظم گڑھ دونوں کی حیثیت لازم و ملزوم کی سی ہے۔ دیکھا جائے تو اعظم گڑھ کی تاریخ دو تین سو سال سے زیادہ نہیں مگر شیراز ہند جونپور کی تاریخ کی روشنی میں خطۂ اعظم گڑھ کے ایسے مقامات کثرت سے روشن ہو جاتے ہیں جہاں علوم و فنون کی مجلسیں آراستہ نظر آتی ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مولف کی نظر میں تو یہ سرزمین ''گوناگوں تمدنی منظر ناموں کے حوالے سے دامان باغبان اور حریف تمکین و ہوش ہے بلکہ قدروں کے امتزاج سے براعظم ایشیا کی رنگارنگی کا دلکش نمونہ ہے''۔ باکمال مصنف نے اعظم گڑھ کی فضیلت کے بنیادی اسباب کی تشریح جس طرح دلائل اور ثبوتوں اور مثالوں کے ساتھ کتاب کے مقدمہ میں بیان کی ہے حقیقتاً اس سے پہلے یہ کوشش کہیں نظر نہیں آتی، کتاب تو سخنوران اعظم گڑھ کے ذکر کے لیے خاص ہے اور پانسو سے زیادہ صفحات کی اس پہلی جلد میں صرف حرف الف سے شروع ہونے والے قریب ڈیڑھ سو شعراء کا تذکرہ ہے۔ جس سے مشاہیر کے علاوہ کم نام یا گم نام شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کی تلاش کی غیر معمولی محنت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن آثم سے ایوب تک اس تذکرہ کو جس چیز نے حیرت انگیز حد تک قابل رشک بنایا وہ فاضل مصنف کا مقدمہ ہے۔ اعظم گڑھ کی ایسی مفصل تاریخ شاید ہی کہیں اس سلیقے سے پیش کی گئی ہو جس میں سو سے زیادہ مصادر سے استفادہ کیا گیا ہو۔ مولانا کی تحقیق اپنی جگہ لیکن ان کی تحریر الگ سے داد طلب ہے۔ عبارت کی پختگی اور کہیں کہیں ادبی گل کاری اور کہیں اچانک جدت طرازی سب نے مل کر اس تذکرہ کو بڑی دلآویزی عطا کر دی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر شعراء کے حالات سے اس خطہ اعظم گڑھ کی سماجی، سیاسی، اقتصادی، حقیقتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ جو اس سرزمین کی شناخت بھی بن جاتی ہیں۔ فاضل مصنف کو جنہوں نے دیکھا ہے ان کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ نہ آیا ہوگا کہ ایسی محنت، ایسی جاں کاہی، ایسی ژرف نگاہی، ان کے حصہ میں آسکتی ہے۔ کسی مقصد کے لیے جسم و جاں وقف کر دینے بلکہ نثار کر دینے کی زندہ مثالیں بہت کم ہیں۔ مولانا مبارک پوری کرونا کی بلا میں رخصت ہو گئے، شہرت کی خواہش کبھی کی ہی نہیں۔ اس لیے ان کے جانے پر بھی کوئی شور نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی وجہ سے دنیائے ادب میں زندہ رہیں گے۔ انہوں نے پانچ چھ جلدوں میں اس تذکرہ کی تکمیل کا اندازہ کیا تھا، اگر ان جلدوں کے مسودے ہیں تو خدا کرے ان کی اشاعت کی کوئی سبیل نکل آئے۔ (ع۔ص)

خواجہ حسن نظامی کی نثر (ثقافتی لائحہ عمل): از ڈاکٹر مولا بخش، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: عرشیہ پبلی کیشنز، اے-۱۷۰، گراؤنڈ فلور-۱۱۱، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی-۱۱۰۰۹۵۔

خواجہ حسن نظامی، اردو کے ان انشاپرداز ادیبوں میں ہیں جن کے بارے میں یہ کہنا بجا ہے کہ ان سے اردو نثر، نظم پر سبقت لے گئی۔ وہ شاید پہلے ایسے صاحب قلم ہیں جن کی تحریروں نے ان کو نرالے اور البیلے ادیب کا خطاب دیا۔ آبائی شناخت تصوف سے تھی اس لیے تصوف کے مسائل ہونا ہی تھے۔ لیکن ان کے قلم کو وسعتوں کی تلاش تھی، اس لیے صحافت، خاکہ نگاری، سیر و سفر کا بیان، روزنامچہ نگاری، انشائیہ، افسانہ وہ ہر مقام پر اپنی جدا شناخت کے ساتھ نظر آتے رہے۔ وہ اس لحاظ سے مظلوم بھی ہیں کہ اردو ادب میں ان کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ واقعتاً حق دار تھے۔ اردو ادب ہی کیا، ایک انسان کی زندگی کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرتی ہے، اس کی غالباً نہایت حقیقی تصویر خواجہ صاحب کی شخصیت تھی۔ ڈاکٹر مولا بخش نے خواجہ صاحب کے ادبی اکتسابات کو اس نظر اور اس پیمانہ سے دیکھنے کی کوشش کی جس کی پہچان ایک خاص نقطہ نظر یعنی مابعد جدیدیت کے نام سے ہوتی ہے، کلاسیک یا ادب عالیہ کے خزانوں کی تلاش میں جدید و معاصر نظریات کا سہارا لینا ایسا معیوب بھی نہیں اور اگر اس میں نیت صاف ہو تو یہ عمل مرغوب بھی ہو سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب سے تو یہی ثابت ہوتا ہے شاید اسی لیے ڈاکٹر صاحب کو خواجہ صاحب کی تحریر میں تاریخ اور تہذیب کی گمشدگی کا کرب اور قوم و ملت کی پس ماندگی اور ملک کی غلامی کا درد نظر آیا۔ یہی کرب و درد و سوز و فکر کسی بھی نثر میں خلوص اور صداقت کے ساتھ شاعری کا سا گداز پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش، اردو ادب و تنقید میں نارنگی نظریات کے حامی و مقلد قرار دیے گئے اس لیے وہ ادبی موضوع یا اسلوب میں ہیئتی تشکیل اور نئے ساختیاتی اجزا کے ظہور کی باتیں بھی کرتے ہیں جو اس نظریہ سے مانوس لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں آج کے تقاضوں کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا وہ عمدہ مطالعہ و تجزیہ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش بھی کورونا کی وبا میں راہی ملک عدم ہوئے۔ شخصی لحاظ سے وہ خواجہ صاحب ہی کی طرح البیلے اور دل لینے والے تھے، جہاں تک علم و تحقیق کا معاملہ ہے تو اگر کوئی معاصر یہ شہادت دے کہ اس کے ہم عصروں میں وہ سب سے زیادہ سنجیدگی اور عمیق مطالعہ سے فن پارے کو پرکھنے والے تھے تو بجائے خود بڑا اعتراف ہے۔ آہ، پروفیسر ظفر احمد صدیقی ہوں، مولانا قمر الزماں ہوں یا ڈاکٹر مولا بخش، کیسے کیسے باکمال، کورونا کی نذر ہو گئے۔ اس وبا و بلا نے جو داغ دیے شاید ہی وہ کبھی مٹ سکیں۔ (ع-ص)

ادبیات

غزل

ڈاکٹر جمیل مانوی

Mob:9837523815

راہ آسان ہے میری یہی دشواری ہے
میری ہمت ہے کہ اب تک یہ سفر جاری ہے

خود کو مدت سے فراموش کیے بیٹھا ہوں
یہ جو تم یاد ہو یہ دل کی رواداری ہے

دل کو احسان محبت سے گراں بار نہ کر
عمر کا بڑھنا تو خود ایک گراں باری ہے

دل تو کہتا ہے، مصیبت میں اکیلا نہ رہوں
جس نے در بند کیے، وہ مری خودداری ہے

کل اسی راہ میں منزل مرا مقصود نہ تھی
آج اس راہ میں ایک ایک قدم بھاری ہے

فتنہ پرداز نئی شان سے اٹّھے اب کے
ہر طرف تیری ذہانت کا فسوں طاری ہے

پوچھ لیتے ہیں کبھی کام بھی آجاتے ہیں
میرے احباب میں اتنی تو رواداری ہے

پردۂ غیب سے بھی سایہ فگن ہے کوئی
وہی انداز محبت، وہی غم خواری ہے

کون مشتاق نہ تھا چہرۂ انور کے لیے
جا چھپے خاک میں یہ کیسی رواداری ہے

علم بھی بھیس بدلنے میں ہے مصروف جمیلؔ
اہل ثروت میں جو خیرات کی تیاری ہے

معارف کی ڈاک

معارف کی زبان

محترم اشتیاق احمد ظلی صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کا میں ممبر ہوں اور باضابطہ اس کے مضامین، خطوط، تبصرے اور خاص طور سے شذرات پڑھتا ہوں۔ بعض مضامین تو بہت ہی تاریخی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جولائی ۲۱ء کے شمارے میں ''وفد خلافت سے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک نادر تحریر'' یا اگست ۲۱ء کے شمارے میں ''اسلامی مدارس کا تسلسل اور ہندوستان کی پہلی دینی درس گاہ۔۔۔''۔ اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک قسط وار مضمون چھپا تھا جس میں اردو میں لکھی گئیں رامائنوں کا بہت عمدہ جائزہ لیا گیا تھا۔

لیکن اسی سلسلے میں اعتراف یہ کرنا ہے کہ آپ کے زیادہ تر معزز اور معتبر مضمون نگار کی اردو ایسی ہے کہ کم از کم مجھ کو تو بغیر ڈکشنری کے آسانی سے پڑھنا اور سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ عربی و فارسی کے الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔ یہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہے۔ جس طرح حال بعید میں ہندی کے لکھنے والوں نے سنسکرت کے الفاظوں کو ٹھونس کر، ہندی کو سنسکرت کے قریب لانے کی کوشش میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ بقول پروفیسر نامور سنگھ کے ہندی کو سنسکرت آمیز کر دیا اور ہندی کو ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ ڈکشنری کی مدد سے پڑھنے میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آج کل کی بول چال کی اردو زبان میں مضامین لکھے جائیں یا لکھوائے جائیں۔ آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ سر سید اور الطاف حسین حالی کے ذریعے استعمال ہونے والی اردو مستعمل ہو تو اردو کو فائدہ پہنچے گا۔

ایک اور پہلو کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ مضمون نگاروں کی زبان اتنی مرقع ہوتی ہے کبھی کبھی مضمون و مفہوم ہی دب جاتا ہے۔ تشبیہات، القاب، مدح سرائی وغیرہ کی اتنی یلغار ہوتی ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ فاضل مضمون نگار اپنے پڑھنے والے سے کوئی کمیونیکیشن کرنا چاہتے ہیں یا اپنی علمی اور لسانی قابلیت کا اظہار کر کے اپنی برتری کا احساس دلانا چاہ رہے ہیں۔ میرا مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ مضامین میں جو اچھی باتیں، علمیت اور پیغام موجود ہوتا ہے ان تک پہنچ جاؤں نہ کہ زبان کی عمیق گہرائیوں میں کھو جاؤں۔

کچھ عرصہ تک تو میں یہ سوچتا رہا کہ بھئی ہر لکھنے والے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے؛ اپنی اپنی انشا پردازی ہوتی

ہے۔ لیکن پھر یہ محسوس ہونے لگا کہ تقریباً ہر مضمون کا یہ ہی انداز ہے اور یہ ہی زبان ہے۔ یہاں تک کہ شذرات کی زبان اور انداز بھی یہی ہے تو یہ سوال ذہن میں آیا کہ کہیں یہ ادارے اور ''معارف'' کی پالیسی تو نہیں ہے کہ ایسی بھاری بھرکم زبان کا استعمال ہی ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں متفکر ہو گیا۔ اور اس لیے آپ کی خدمت میں یہ عرضداشت بھیج رہا ہوں کہ معارف کی اردو کی طرف توجہ کریں اور ہم جیسے پڑھنے والوں کا خیال کریں۔

ایک دوسری بات: کچھ دن پہلے واٹس ایپ پر دیکھا تھا کہ دارالمصنّفین / شبلی اکیڈمی کی مالی حالات کو بہتر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں آپ کا لائف ممبر بن کر کچھ تعاون کر سکتا، مدد گار ہو سکتا ہوں تو مجھ کو ضرور مطلع کریے گا۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

دعاؤں کا طلب گار، آپ کا مخلص

خواجہ محمد شاہد

khwajashahid@hotmail.com

****

رسید کتب موصولہ

ادبی نگارشات: ڈاکٹر غلام نبی مومن، سیفی بک ایجنسی، امین بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔

قیمت: ۱۶۰ روپے

اردو کے چند نمائندہ طنز و مزاح نگار: ڈاکٹر رفیق احمد، مکتبہ نعیمیہ صدر چوک، مئوناتھ بھنجن (یوپی)۔

قیمت: ۱۱۶ روپے

اردو میں نفسیاتی تنقید: ڈاکٹر غلام نبی مومن، روم نمبر ۲، چودھر چال، چودھری محلہ کلیان، تھانے۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

اسلام امن و سلامتی کا راستہ: پروفیسر اختر الواسع، اسلامی بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

القاضی ابوالمعالی اطہر المبارکفوری: ڈاکٹر اورنگ زیب الاعظمی، مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔

قیمت درج نہیں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بحیثیت مصنف (حصہ دوم) پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی: ترتیب و تقدیم محمد عرفات اعجاز اعظمی، مکتبہ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

شیخ جمعہ الماجد حفظہ اللہ: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، پرویز بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ۔

قیمت: ۲۰۰ روپے

عورت قرآن کریم میں: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔

قیمت: ۴۵۰ روپے

لؤلؤا منثوراً (مجموعہ کلام): مولانا محمد نعیم الرحمن، جامعہ اسلامیہ اشرف العلوم، آزاد نگر، کرامت کی چوکی کریلی، الہ آباد۔

قیمت: ۱۰۰ روپے

وفیات اطباءِ ہند و پاک (جلد سوم حصہ اول): حکیم وسیم احمد اعظمی، اصلاحی ہیلتھ کیئر فائونڈیشن، نئی دہلی۔

قیمت: ۴۰۰ روپے

****

مضمون نگاروں کے لیے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جا رہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ / صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	250/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	----
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) //	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) //	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) //	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) //	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) //	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) //	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) //	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	200/-
مکاتیب شبلی اول //	150/-
مکاتیب شبلی دوم //	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974-7346 Maarif (Urdu) Print **NOVEMBER 2021** Vol. 208/5

RNI No. 13667/57 **MAARIF** AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibi Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	100/-
۲۔مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۳۔مطالعاتِ شبلی	اشتیاق احمد ظلی	550/-
۴۔حیاتِ سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۵۔شبلی شناسی کے اولین نقوش	ظفر احمد صدیقی	600/-
۶۔آپ بیتی (مرتب: ڈاکٹر خالد ندیم)	علامہ شبلی نعمانی	325/-
۷۔امام رازیؒ	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
۸۔حیاتِ سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	600/-
۹۔تذکرۃ المحدثین اول	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	200/-
۱۰۔تذکرۃ المحدثین دوم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	225/-
۱۱۔تذکرۃ المحدثین سوم	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	300/-
۱۲۔محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	120/-
۱۳۔مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۱۴۔ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
۱۵۔تاریخ اسلام اول و دوم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	375/-
۱۶۔تاریخ اسلام سوم و چہارم (مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۷۔تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندوی	400/-
۱۸۔تاریخ صقلیہ دوم	سید ریاست علی ندوی	400/-
۱۹۔اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
۲۰۔یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	100/-